بی۔اے : سال اول (سیمسٹر ۱)

(اردو لازمی)

F. Y. B. A. (Semister - I)

(Urdu Compulsory)

Subject Code : UBA 1.6

© UNIVERSITY OF MUMBAI

© یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر سہاس پیڈنیکر
وائس چانسلر
یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر رویندر کلکرنی
پرو۔وائس چانسلر
یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر پرکاش مہانوَر
ڈائرکٹر
فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)، یونیورسٹی آف ممبئی

پروگرام کوآرڈینٹر : **ڈاکٹر انل بنکر**
صدر، فیکلٹی آف ہیومینیٹیز
فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)، یونیورسٹی آف ممبئی

کورس رابطہ کار و مدیر : **ڈاکٹر معزہ (قاضی) دلوی**
فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)، یونیورسٹی آف ممبئی

مضمون نگار :

ڈاکٹر مزمل سرکھوت **(اکائی:1)**
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ممبئی

ڈاکٹر رونق رئیس **(اکائی:2)**
اسوسی ایٹ پروفیسر،
شعبہ اُردو، بی۔این۔این کالج، بھیونڈی

ڈاکٹر ماجد قاضی **(اکائی:3)**
اسوسی ایٹ پروفیسر،
صدر، شعبہ اُردو، مہاراشٹر کالج، ممبئی

ڈاکٹر عباس عالم **(اکائی:4)**
اسوسی ایٹ پروفیسر،
صدر، شعبہ اُردو، رضوی کالج، ممبئی

پروفیسر شرف النہار **(اکائی:5)**
صدر، شعبہ اُردو،
ڈاکٹر رفیق زکریا کالج فار ویمن، اورنگ آباد

جناب امیر حمزہ **(اکائی:6)**
اسسٹنٹ پروفیسر و
صدر، شعبہ اُردو، جی۔ایم۔مومن ویمنس کالج، بھیونڈی

ڈاکٹر مزمل سرکھوت **(اکائی:7)**
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ممبئی

ڈاکٹر مزمل سرکھوت **(اکائی:8)**
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ممبئی

جنوری 2021 طباعت۔I

پبلشر : ڈائرکٹر،
فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)، یونیورسٹی آف ممبئی

ماہر طباعت و ٹائپسٹ : جناب عبدالمنان فہیم احمد شیخ
پرنٹر : ممبئی یونیورسٹی پریس

نصاب

(حصہ اول)

اکائی 1 : مضمون نگاری اور محاورے

اکائی 2 : میر امن دہلوی، سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد

اکائی 3 : مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، کرشن چندر

اکائی 4 : خواجہ الطاف حسین حالی، میر انیسؔ، نظیر اکبر آبادی

اکائی 5 : اکبر الہٰ آبادی، چکبست، جوش ملیح آبادی

اکائی 6 : مرزا محمد رفیع سودا، میر درد، میر تقی میر

اکائی 7 : مرزا غالبؔ، داغؔ دہلوی، شادؔ عظیم آبادی

اکائی 8 : امجدؔ حیدر آبادی، یاس یگانہؔ چنگیزی

نمونۂ امتحانی سوالیہ پرچہ

کل نمبرات:　۱۰۰　　　　وقت:　۳ گھنٹے

تمام سوالات لازمی ہیں۔

ہر سوال کے نمبر اس کے سامنے دیے گئے ہیں۔

سوال نمبر ا: (الف) دیے گئے عنوانات میں سے کسی ایک عنوان پر مضمون لکھنا ہوگا۔ (10)

(ب) دیے گئے محاوروں میں سے کوئی پانچ محاوروں کی معنی لکھ کر جملوں میں استعمال کرنا ہوگا۔ (10)

سوال نمبر ۲: نثر نگاروں پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔ (20)

سوال نمبر ۳: نظم رغزل گو شعرا پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔ (20)

سوال نمبر ۴: (الف) دیے گئے نثری عنوانات میں سے کسی ایک عنوان پر تفصیلی گفتگو کرنی ہوگی۔ (10)

(ب) نظم کے عنوانات میں سے کسی ایک نظم کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ (10)

سوال نمبر ۵: (الف) دیے گئے چار اقتباسات میں سے کوئی دو اقتباسات کی سیاق وسباق کے حوالے سے وضاحت کرنی ہوگی۔ (10)

(ب) دیے گئے تین اشعار میں سے کسی ایک شعر کی تشریح مع شاعر کے نام۔ (05)

(ب) دیے گئے تین بند میں سے کسی ایک بند کی مع سیاق وسباق تشریح۔ (05)

☆☆☆

اکائی : 1۔ مضمون نگاری اور محاورے

ساخت:

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 مضمون نگاری

1.3.1 مختلف موضوعات پر مضامین کی مشق

1. 4 محاورے

1.4.1 مشقی محاورے

1.5 خلاصہ

1.6 نمونہ امتحانی سوالات

1.7 فرہنگ

1.8 معاون کتابیں

1.1 اغراض ومقاصد

طالب علم میں لکھنے اور موضوع کو مناسب انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے مضمون نگاری کو سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ادب کے طالب علم کے لیے لکھنے میں مہارت ہونا ایک لازمی امر ہے۔موضوع چاہے ادبی ہو، سیاسی ہو، معاشی ہو، ثقافتی ہو یا کسی اور شعبہ ہائے حیات سے مستعار ہو، اس پر لکھنے اور اسے بہتر انداز میں پیش کرنے کی قابلیت ہونا طالب علم میں خوبی شمار ہوتی ہے۔اس اکائی میں مضمون نگاری کی تعریف، اس کے لوازمات، اس کی خصوصیات اور اس کی باریکیاں بیان کی گئیں ہیں۔جن کے مطالعے کے بعد مضمون نگاری کے فن میں طبع آزمائی کی جاسکے گی۔مزید رہنمائی کے لیے مضمون نویسی کی عملی مشق کے طور پر چند مختلف موضوعات پر مختصر مضامین شامل کیے گئے ہیں جن سے طلبا مستفید ہوسکتے ہیں۔

1.2 تمہید

مضمون نگاری ایک فن ہے۔مضمون کی بنیاد کسی عنوان پر ہوتی ہے۔دنیائے رنگ و بو میں عنوانات کی کثرت ہے۔فطرت،نفسیات، ماحول، سیاست،تعلیم،شخصیات، کاروبار،کھیلوں کی دنیا،ادب، سائنس وغیرہ بے شمار موضوعات اور ان کے لاتعداد عنوانات موجود ہیں۔مضمون نگاری کے لیے مضمون نگار کی ذاتی دلچسپی اور موضوع یا عنوان سے ذہنی مناسبت لازمی عناصر متصور ہوتے ہیں۔ان کے بغیر اور زور زبردستی سے لکھا جانے والا مضمون کامیاب نہیں ہو پائے گا۔
علامہ اقبالؔ کے ایک شعر سے اس بات کو سمجھا جاسکتا ہے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　　پر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

1.3 مضمون نگاری

کسی ایک موضوع یا عنوان کو بتفصیل مثالوں، محاوروں اور ضرب المثل کے ساتھ بیان کرنا یا لکھنا مضمون نگاری کہلاتا ہے۔ بعدازاں کوئی قلم کار ایک تحریر کی وجہ سے امر بن جاتا ہے اور اکثر کاغذوں کو سیاہ کرتے ہوئے اپنی زندگیاں ختم کر لیتے ہیں لیکن ان کی تحریریں کسی قدر کی مستحق نہیں بن پاتیں۔مضمون نگار کے قلم میں مقناطیسی وصف لازمی ہے، زبان پر عبور، محاوروں اور ضرب المثل پر مہارت، مناسب اور موزوں اصطلاحات اور استعارات وتشبیہات کا استعمال نیز الفاظ کی بندش میں مشاقی ضروری اجزائے انشا قرار دیے جاسکتے ہیں۔مضمون نگار قاری کے ذہن کو اپنی جانب ملتفت کرنے ، اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہونے اور اپنے سحر میں گرفتار کرنے کا ہنر جانتا ہو۔ بعدازاں انتہائی اہمیت کا حامل مضمون تحریر کی ناپختگی کی وجہ سے اپنی اہمیت کھو دیتا ہے اور اس کے برعکس ایک عام سا مضمون راقم کی زبان و بیان پر فنکارانہ مہارت کی وجہ سے دیرپا اثرات کا حامل بن جاتا ہے۔لہٰذا مضمون میں موضوع کے بعد انداز پیش کش اور انداز اظہار مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ذوقؔ دہلوی نے کہا تھا

رہتا قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ　　　اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

عنوان اور موضوع سے دلی وابستگی اور ذاتی دلچسپی ہونی چاہیے جب کہیں بہترین تحریر وجود میں آئے گی۔ابتدائی مرحلے میں آسان عنوانات کا انتخاب ہونا چاہیے۔آسان موضوعات پر لکھنے کی مشق مزید لکھنے کی تڑپ میں تبدیل ہوگی۔مرحلہ وار آسان سے مشکل اور مشکل سے مشکل ترین عنوانات اور اس پر تحریر کے لیے تیار کیا جانا چاہیے۔آسان سے مشکل کی جانب سفر کا یہ طریقہ تحریر میں پختگی کی ضمانت بھی بنے گا ،تحریر میں شفافیت، شگفتگی، کشش اور جاذبیت پیدا کرنے میں مدد و معاون بھی

ہوگا۔اس طریقہ سے مضمون کی ظاہری ساخت میں خوش گوار مہارت حاصل ہوجائے گی اور باطنی ساخت بھی اپنی خوبصورتی اور سادگی کے ساتھ نکھرتی جائے گی۔تحریر ظاہری اور باطنی خوبیوں کا مجسمہ ہوتی ہے۔باطنی خوبیوں تک پہنچنے کے لیے ظاہری لبادہ پر محنت کرنی پڑتی ہے، بعدازاں مشکل سے مشکل عنوان یا موضوع آسان زبان میں اپنی بات منوالیتا ہے،اور بعدازاں آسان عنوان مشکل ترین لفظیات اور خوبصورت مرصع سازی کے بعد بھی اپنے مطلب سے دور رہتا ہے۔مضمون کو ظاہری لباس نہایت زرق برق پہنایا گیا مگر اس میں جان نہیں ڈالی گئی تو وہ اپنا مقصد بیان کرنے سے قاصر رہے گا۔

عنوان کے وسیع مفہوم کو سمجھنے اور صفحہ قرطاس پر اتارنے کے عمل میں ذیلی عنوانات مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ذیلی عنوانات خیالات کو ایک ترتیب میں پرونے اور انھیں قسط وار ادا کرنے میں مدد کرتے ہیں جس سے غیر ضروری خیالات اور ان کے اظہار اور طول طویل تقریر سے بچا جا سکتا ہے۔ذیلی عنوانات موضوع کو محدود کرنے یا ضرورت کے مطابق وسعت دینے میں بھی مضمون نگار کے معاون کے طور پر کام آتے ہیں۔خیالات کی ترتیب اور تحریر میں جاذبیت پیدا کرنے کی سہولت بھی ذیلی عنوانات سے حاصل ہوتی ہے۔

مضمون کا عنوان طے ہوجانے کے بعد مضمون نگار کے لیے اس عنوان کے مطابق معلومات درکار ہوتی ہیں۔ معلومات تک رسائی ہوجانے کے بعد ان کی ترتیب نیز تزئین کا مرحلہ ہوتا ہے کہ جس سے تحریر میں جان پیدا کی جاتی ہے۔قلم کار الفاظ کی ترتیب و بندش میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے ماحول بناتا ہے،جس طرح ایک مصور مناسب ترین رنگ کا انتخاب کرتا ہے، جہاں سفید رنگ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہاں ہرا رنگ استعمال نہیں کرتا، جہاں لال رنگ سے تصویر کو رنگین بنانا لازمی سمجھتا ہے وہاں پیلا یا سیاہ رنگ نہیں اتارتا، بالکل اسی طرح مضمون نگار بھی الفاظ کے انتخاب میں تنقیدی طریقہ اختیار کرتا ہے۔بعدازاں ایک معنی کے مترادفات کے استعمال میں بھی چابکدستی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔عنوان کی اہمیت اور اس کی لاثانی معنویت کا ادراک مضمون کے پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔مضمون میں اثر انگیزی پیدا کرنے کے لیے اور الفاظ کے انتخاب میں ہنرمندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے وسیع مطالعہ اور مضمون نگاری کی مسلسل مشق کارآمد ثابت ہوتے ہیں کہ کثرت مطالعہ فطرت کے سربستہ رازوں سے واقفیت حاصل کرنے میں مددگار ہوتا ہے اور مشق مضمون الفاظ کے درست استعمال اور ناقابل استعمال نیز محل استعمال سے روشناس کرنے کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔

مشرق لکھ یا بول کر مغرب مراد نہیں لی جاتی، آسمان کہہ کر یا رقم کر کے زمین کی معنی نہیں حاصل ہوتی اسی لیے الفاظ کے مناسب استعمال اور ان کے ساتھ ذہنی تطابق ہونا لازمی ہے۔ذہن ایک بات کہنا چاہ رہا ہو اور قلم کوئی اور بات رقم کرتا چلا جائے تو وہ مضمون یا تحریر موثر ہونے کی بجائے ناقابل فہم وادراک نیز گنجلک بن جائے گی۔الفاظ خیالات کے

لیےلباس کی حیثیت رکھتے ہیں۔سخت بات کے اظہار کے لیے نہ تو انداز بیان ملائم ہونا چاہیےاور نہ ہی الفاظ نرم استعمال ہونے چاہیے۔ بات خیالات کی ترجمانی کرتی ہے، اور بات میں الفاظ متشکل ہوتے ہیں، خیالات میں گرم جوشی ہوگی تو بات میں بھی اس کا اظہار ہونا فطری ہے۔مضمون نگار کو اپنی تحریر کو آخری شکل دینے سے پہلے اس بات سے اطمینان کر لینا چاہیے کہ اس کے الفاظ نے خیالات اور موضوع نیز عنوان سے انصاف کیا ہے۔

مضمون لکھنے سے قبل عنوان کے تعلق سے ذہن تیار ہونا چاہیے۔عنوان کے مختلف پہلوؤں پر سوچ و چار ہو، کیوں کہ عنوان موازنے سے تعلق رکھنے والا ہوسکتا ہے، کسی شخص کی نفسیاتی کیفیت کے مطالعے سے تعلق رکھنے والا ہوسکتا ہے اور دیگر پہلوؤں سے محیط عنوان پر غور وخوض کے بعد لکھنے کا عمل شروع ہوگا۔عنوان کے تقاضوں کے مطابق ترکیب بنے گی۔عنوان اور اس کی ترکیب کے بعد مواد کی ترتیب کا مرحلہ سامنے ہوتا ہے۔

مضمون کا آغاز کرتے ہوئے غیر متعلق الفاظ یا جملوں سے گریز لازمی ہے۔نفس مضمون سے تمہیدی یا ابتدائی جملوں کا تعلق ہونا چاہیے۔مناسب شعر، مشہور مقولہ، کسی مفکر کا خیال، انگریزی یا کسی اور زبان کا جملہ یا محاورہ عنوان سے ملا جلا ہو۔تمہید مضمون کے لیے فضا تیار کرتی ہے، اسے غیر ضروری جملوں اور غیر مناسب محاوروں یا تمثیلات سے محفوظ کرکے مناسب و متوازن الفاظ کی کہکشاں سے زینت دینا اور پرکشش بنانا چاہیے۔عنوان مغرب سے متعلق ہو اور تمہید مشرق کی بات کرتی ہو تو اسے درست تمہید نہیں سمجھا جائے گا۔ بعد ازاں تمہید پڑھ کر مضمون کا لب لباب سمجھ میں آجاتا ہے۔تاہم یہاں مضمون نگار کے لیے پل صراط سے گزرنا ہوتا ہے کہ قاری کو عنوان کے قریب بھی کرنا ہے اور مضمون کا لب لباب سمجھنے کے لیے مکمل مضمون پڑھنے کی جانب راغب بھی کرنا ہے۔تمہید مضمون نگار کا پہلا مشکل مرحلہ ہوتا ہے، یہاں سے سرخ رو گزرنا مشق کا متقاضی ہوتا ہے۔

مضمون نگاری کے لیے تمہید کے بعد نفس مضمون پر توجہ مبذول کرنے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔نفس مضمون کا تعلق براہ راست مضمون کے عنوان سے ہوتا ہے۔اس میں مضمون نگار اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، قارئین کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے دلائل پیش کرتا ہے۔مضمون کا یہ حصہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ قاری کو مضمون سے براہ راست روبرو کراتا ہے اور عنوان سے مطابقت پیدا کرتا ہے۔کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ مضمون نگار اپنی تحریری صلاحیت تمہید میں صرف کرتا ہے اور نفس مضمون تک آتے آتے چند جملوں کی دولت لیے ہوتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔تمہید کو بحیثیت ایک سیڑھی استعمال کرنا چاہیے اور قدم قدم چلتے ہوئے منزل پر پہنچ جانا چاہیے۔نفس مضمون کو منزل کہہ سکتے ہیں کہ اس مرحلہ میں عنوان کو سمیٹ لیا جاتا ہے اور آخر میں عبرت یا سبق آموز جملہ مضمون کا اختتام کرجاتا ہے۔یہ مقامِ آخر مکمل مضمون کا خلاصہ ہوتا ہے نیز مضمون نگار کے نقطہ نظر کی تشہیر کا فریضہ ادا کرتا ہے تاکہ قاری اس مضمون سے کوئی نتیجہ اخذ کرے۔نفس مضمون کی مناسبت

سے مضمون کی چند قسمیں متعین کی جاسکتی ہیں جن میں بیانیہ (سوانحی، واقعاتی، حادثاتی وغیرہ)، فکریہ (فلسفیانہ، اخلاقیات، مباحث وغیرہ)، مدحیہ (مناظر، بااثر اشخاص، پھل وغیرہ)، تفریحی (کھیل، سنیما، مشغلے وغیرہ) ہیں۔

مضمون میں کسی نکتہ کو مدلل انداز اور سلیس زبان نیز موزوں الفاظ کے ساتھ تحریر کیا جاتا ہے۔ جس طرح عناوین بیشمار ہیں اسی طرح مضمون کے اقسام کی بھی فہرست سازی کی جاسکتی ہے اور اسی مناسبت سے مواد اور توضیح مضمون کی زینت بن جائے گی۔

رموز واوقاف:

مضمون میں کون سا جملہ کب ختم ہو رہا ہے؟ کون سا جملہ عطف کے ساتھ شروع ہوا ہے؟ جملوں کے درمیان جاری گفتگو میں کب ٹھہرنا ہے؟ کب تسلسل قائم رکھنا ہے؟ یہ ساری تفصیلات رموز واوقاف کے سمجھنے پر منحصر ہیں۔

(۱) سکتہ (Comma):

یہ سب سے چھوٹا وقفہ ہوتا ہے جو جملے کے اندر توقف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی اس کا استعمال شعرفہمی کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ سکتہ کو علامت کے طور پر ، لکھا جاتا ہے۔

(۲) وقفہ (Semi Colon) :

وقفہ سکتے سے زیادہ وقت ٹھہرنے کی اجازت دیتا ہے۔ وقفہ کو ؛ اس علامت سے ظاہر کرتے ہیں۔

(۳) رابطہ (Colon) :

رابطہ کے ٹھہراؤ کی مدت وقفہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ رابطے کو : علامت سے پہچانا جاتا ہے۔ بعدازاں رابطے کے آگے چھوٹا سا خط بھی کھینچا جاتا ہے تب اس کی شکل :- ایسی بن جاتی ہے۔

(۴) ختمہ (Full Stop) :

جملہ ختم ہونے پر ختمہ کا استعمال کرتے ہیں۔ ختمہ کو ۔ اس طرح علامتی انداز میں ظاہر کیا جاتا ہے۔

(۵)واوین(Inverted Commas) :

مضمون کے درمیان کوئی اہم اقتباس آجائے تو اس کو واوین میں لکھا جاتا ہے، بعدازاں کسی کا قول یا کسی کی بات کو بھی واوین میں لکھا جاتا ہے۔ پہلے واوین کو '' اور آخری واوین کو '' کی علامت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔

(۶)قوسین(Brackets) :

قوسین اس وقت استعمال کیے جاتے ہیں جب اقتباس کے کسی اہم جزو کو قدرے تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت آن پڑتی ہے، حالانکہ جزو کی اس تفصیل کو جملے میں شمار نہیں کیا جاتا۔ وہ جملے کے اس جزو کی وضاحت کے طور پر قوسین میں ظاہر کی جاتی ہے۔ قوسین کو ( ) علامت سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

(۷)ندائیہ۔فجائیہ(Note of Exclamation) :

کسی کو پکارنے کے لیے جب نام لیا جاتا ہے تو نام کے ساتھ ایک علامت استعمال کی جاتی ہے، نیز کسی جذبے کے اظہار میں جو حیرت ظاہر کرنے والا لفظ استعمال کرتے ہیں اس کے فوراً بعد جو علامت ہوتی ہے اسے ندائیہ۔فجائیہ علامت کہتے ہیں۔ اس علامت کو ! اس طرح لکھا جاتا ہے۔

(۸)سوالیہ نشان(Note of Interrogation) :

استفسار کے لیے جو جملہ لکھا جاتا ہے اس کے آخر میں سوالیہ نشان لگا دیا جاتا ہے۔ سوالیہ نشان کو ؟ اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے۔

درج بالا رموز واوقاف جملے کی بندشوں کو مضبوطی عطا کرتے ہیں۔ اور انھیں آسان اور قابل فہم بناتے ہیں۔

1.3.1 مختلف موضوعات پر مضامین کی مشق

ذیل میں ہم مختلف نوعیت کے مختلف مضامین کو لکھنے اور ان کو سمجھنے کی مشق کریں گے۔

گاندھی جی

بھارت تقریباً دوسو سال انگریزوں کی غلامی میں رہا۔ یہ غلامی نہ صرف ظاہری تھی بلکہ انگریزوں نے ذہنوں تک کو گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ لہٰذا پہلی تحریک آزادی یعنی ۱۸۵۷ء کی ناکامی سے عبرت حاصل کرتے ہوئے انگریزوں

سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جو دوسری تحریک شروع ہوئی وہ کافی حد تک جذبات سے زیادہ شعور اور عقل کا استعمال کرتے ہوئے عمل میں لائی گئی۔اور اس تحریک آزادی کے ایک نہایت اہم ستون کی حیثیت سے موہن داس کرمچند گاندھی یعنی گاندھی جی کی شخصیت سب سے نمایاں ہے۔

گاندھی جی ہٹے کٹے یا موٹے تازے جسم کے مالک نہیں تھے،اس کے برعکس وہ بالکل دُبلے پتلے اور نازک بدن کے مالک تھے۔مگر ان کی قوت ارادی فولاد کی مانند تھی۔انھوں نے وکالت کی تعلیم حاصل کی تھی،اسی لیے وہ معاملے کے سارے پہلوؤں کو پرکھتے تھے،ہر ممکن نکات پر ان کی توجہ ہوتی تھی۔اس کے بعد وہ کوئی نتیجہ اخذ کرتے تھے۔گاندھی جی وکیل پیشہ ہونے کے باوجود پوشاک کے سلسلے میں زمینی سطح کے انسان تھے۔وہ ظاہری چمک دمک سے زیادہ باطنی روشنی کو اہمیت دیتے تھے۔وہ بہت کم کپڑا زیب تن کرتے تھے۔لیکن یہ لاغر اور کمزور سا شخص جس کے بدن پر کپڑے بھی مکمل نہیں ہوتے تھے انگریزی سامراج کے لیے کسی طاقتور مخالف سے کم نہیں تھا۔گاندھی جی نے اپنی بات بھارت کی غریب عوام کو بھی نہایت آسانی کے ساتھ سمجھانے کی کامیاب کوشش کی اور پڑھے لکھے انگریزوں کو بھی بھارت کی نبض کو سمجھنے اور اپنا بوریا بستر گول کر لینے پر آمادہ کیا۔

گاندھی جی تشدد کو سخت ناپسند کرتے تھے۔انھوں نے حکومت کے خلاف بڑے بڑے احتجاجات کیے،بڑے دھرنے دیے،ستیہ گرہیں کیں،لیکن عدم تشدد کے اصول کے ساتھ۔ایک بار بھارت کے عوام نے ستیہ گرہ کے دوران ایک پولس اسٹیشن کو جلا دیا اور انگریزوں کا نقصان کیا،آسان زبان میں کہیں تو تشدد کا راستہ اختیار کیا،گاندھی جی نے اس کی مذمت کرتے ہوئے فوراً اپنا ستیہ گرہ ختم کیا اور تشدد کے خلاف اپنی سخت رائے پیش کی۔جس طرح انگریز حکمرانوں کو بھارتی عوام کی مانگوں سے واقف کرانے کے لیے ستیہ گرہ اور احتجاج کا راستہ اختیار کرتے تھے،اسی طرح وہ عوام کو تشدد سے روکنے کے لیے بھی عملی طور پر میدان میں آجاتے تھے۔

عدم تشدد اور اہنسا کی تشہیر کرنے والے گاندھی جی کو ملک کی آزادی کے بعد ان کے ہم مذہب نے تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا۔لیکن ملک نے گاندھی جی کے عدم تشدد کو اپنے لیے پسند کر لیا تھا اور ان کے قاتل کے تشدد کے رویے کو رد کر دیا تھا۔گاندھی جی کو بابائے قوم کہتے ہیں۔ہمارے ملک کے کرنسی نوٹ پر گاندھی جی کی تصویر ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مرزا غالبؔ

اردو ادب کی پہچان شاعری ہے اور اردو شاعری کی شناخت مرزا غالبؔ ہیں۔ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ آگرہ میں پیدا ہوئے مگر زندگی کا اکثر حصہ دہلی میں گزارا۔ مرزا غالبؔ نے کم عمری میں شادی بھی کی اور شاعری کی شروعات بھی کی۔ اردو شاعری کی تاریخ میں مرزا غالبؔ ایک اہم باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں آسان اور سادگی بھرے انداز میں بڑے فلسفیانہ نکات تلاش کیے گئے ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے　　ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

دنیا میں ہونے والی تبدیلیاں یا ہنگامے غالبؔ کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوتے تھے، انھوں نے زندگی میں ایسی مشکلات کا سامنا کیا تھا کہ جن کے سامنے دنیا کی کوئی بھی تعجب انگیز بات انھیں متحیر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دنیا کو بچوں کا باغیچہ کہہ کر گویا اس بات کی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ جس طرح بچوں کے باغیچہ میں کوئی بڑی سے بڑی حرکت قابل توجہ نہیں ہوتی، اسی طرح دنیا میں ہونے والی کوئی بھی تبدیلی انھیں حیرت میں نہیں ڈال پاتی۔ انھیں تو جیسے معلوم ہو کہ یہ سب ہونی جانی باتیں ہیں۔

مرزا غالبؔ پر اردو میں سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ ان کے ایک شاگرد الطاف حسین حالی نے ''یادگار غالب'' کتاب لکھی جس میں مرزا غالب کی زندگی کی کئی نیرنگیاں درج کی ہیں۔ مرزا غالبؔ کے کئی لطیفے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں ایک بار وہ اپنے گھر کے ایک کمرے میں شراب سے شغل فرما رہے تھے۔ اسی وقت ایک جانکار ان سے ملنے آ گئے۔ اجازت طلب کی گئی۔ مرزا غالبؔ نے اجازت دی۔ وہ صاحب اندر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ رمضان جیسے مبارک مہینے میں شراب کا دور چل رہا ہے۔ انھوں نے کہا ''قبلہ غالبؔ! ہم نے تو سنا ہے کہ رمضان میں شیاطین قید کر لیے جاتے ہیں۔'' مرزا غالبؔ نے فوراً کہا ''جی! یہی وہ کمرہ ہے جس میں شیاطین کو قید کر لیا جاتا ہے۔''

ایک بار قدیم دلی کالج میں فارسی کے استاد کی اسامی کے لیے مرزا غالبؔ کو کالج جانے کا موقع ملا۔ مرزا سواری پر سوار ہوئے اور کالج کے گیٹ پر سواری روک دی اور دربان سے کہا ''پرنسپل صاحب کو اطلاع دو کہ مرزا غالبؔ آئے ہیں۔'' دربان دوڑا ہوا پرنسپل صاحب کے پاس گیا اور مرزا صاحب کا پیغام سنایا۔ پرنسپل صاحب نے دربان سے کہا ''مرزا غالبؔ سے کہو کہ آپ ابھی اسامی کے لیے انٹرویو دینے آئے ہیں، ابھی ملازمت کا معاملہ طے نہیں ہوا ہے، جب آپ کی ملازمت یہاں پکی ہو جائے گی تو ہم روز آپ کے استقبال کے لیے گیٹ پر حاضر رہیں گے، تاہم آج آپ بحیثیت امیدوار آئے ہیں۔ آپ کو خود پرنسپل کے دفتر آنا ہوگا۔'' یہ جواب سن کر مرزا نے سواری کا رخ موڑ دیا اور سیدھے گھر پہنچ

گئے، وجہ یہ بتاتے تھے کہ ''اس قدر توہین کہ استقبال کے لیے پرنسپل نہیں آیا، نہیں چاہیے ایسی ملازمت۔''

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد مرزا غالبؔ کی زندگی کافی تنگ دستی کی رہی۔ اس واردات کے تقریباً ۱۲ سال بعد ۱۸۶۹ء کو مرزا غالبؔ کا دہلی میں انتقال ہوا۔

☆☆☆☆☆

برسات کا موسم

ہمارے ملک کو قدرت کی بہت خوبصورت سوغات ہے چار موسموں کا ادل بدل کر آنا۔ دنیا کے کسی اور خطے کو یہ رحمت نصیب نہیں ہوئی ہے۔ دنیا میں کچھ ممالک ایسے ہیں کہ جہاں مسلسل سردی کا موسم ہوتا ہے، کہیں مسلسل گرمی، کہیں روزانہ بارش کا مسئلہ، کہیں گرمی اور سردی کا کوئی وقت متعین نہیں۔ اور بارش بن بلائے مہمان کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر شکر ہے خدا کا کہ ہم اس نعمت سے سرفراز ہیں کہ ہر موسم متعینہ وقت پر آتا ہے اور دوسرے موسم کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔

برسات کا موسم تمام موسموں کے سر کا تاج ہے، موسم بہار ہے۔ سوکھی زمین خوشی سے جھومنے لگتی ہے، پیڑ پودے سرسراہٹ کے انداز میں اپنی خوشیاں ظاہر کرتے ہیں، پرندے چہچہاتے ہوئے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں، پہاڑ سبز چادر اوڑھ کر اپنی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں، کھیت کھلیان لہک لہک کر برسات کے موسم کا لطف اٹھاتے ہیں۔ انسان اور جانور بھی برسات کے موسم کو اپنی زندگی کے حسین ترین لمحات کا ثمر سمجھتے ہیں۔ اردو کے کئی شاعروں نے برسات کے موسم پر نہایت خوبصورت نظمیں لکھی ہیں، ہندی کے کویوں نے ساون کے مہینوں پر کئی کویتاؤں کی رچنا کی ہیں، اسی طرح دوسری زبانوں کے شاعروں نے بھی برسات کے موسم کی رنگینیوں کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

برسات کا موسم ہریالی کا ضامن ہوتا ہے۔ سرسبز و شاداب ماحول سے دنیا کی رنگینی میں مزید نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ برسات گرمی کے بعد آنے والا موسم ہوتا ہے۔ گرمی سے پریشان قدرت کی ساری نشانیاں برسات کا بڑی شدت سے انتظار کرتی ہیں۔ ان نشانیوں میں انسان ہیں، جانور ہیں، پرند ہیں، نباتات ہیں، ندی نالے، سمندر، پہاڑ، کھیت سب ہوتے ہیں۔ جب برسات کی پہلی بوند زمین پر پڑتی ہے تو زمین اپنی سب سے حسین خوشبو سے اس کا استقبال کرتی ہے۔ زمین کی یہ خوشبو اور ہواؤں کی اطلاع برسات کی خوش خبری بن کر سماں کو خوشنما بنا دیتے ہیں۔ اردو کے ایک اہم شاعر الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور نظم '' برکھا رت'' میں برسات کو اس طرح بیان کیا ہے

؎ گرمی کی تپش بجھانے والی سردی کا پیام لانے والی

ے وہ سارے برس کی جان برسات وہ کون خدا کی شان برسات
ے آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد وہ سینکڑوں التجاؤں کے بعد
ے گرمی سے تڑپ رہے تھے جان دار اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار

گرمی کا موسم جب طول پکڑتا ہے اور بارش اپنے وقت پر نہیں آپاتی تو کافی پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر مخلوق پانی کے لیے تڑپ رہی ہوتی ہے۔ گویا برسات کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ اسلام میں ایسے وقت نفل نماز ادا کر کے بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔ باران رحمت کے نزول تک دعاؤں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور جب بارش اپنا جلوہ دکھانا شروع کرتی ہے تو شکرانہ ادا کیا جاتا ہے اور ہر طرف خوشیوں کا سماں بندھ جاتا ہے۔ اردو کے شاعر نظیر اکبرآبادی نے اس موضوع پر ایک شاندار نظم لکھی ہے ''برسات کی بہاریں''، اس نظم کا ایک بند یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ے ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے
قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے
بچھوا دیے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

☆☆☆☆☆

کرکٹ: ایک تعارف

دنیا میں بے شمار کھیل ہیں۔ ہر کھیل اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ کچھ کھیل انڈور ہوتے ہیں اور کچھ آؤٹ ڈور ہوتے ہیں، کچھ کھیل بچوں کے ہوتے ہیں، کچھ کھیل لڑکیوں کے ہوتے ہیں تو کچھ لڑکوں کے، کچھ کھیل مشترک ہوتے ہیں، انھیں لڑکیاں بھی کھیلتی ہیں اور لڑکے بھی کھیلتے ہیں۔ اور کچھ کھیل ایسے بھی ہیں جن میں لڑکے لڑکیاں مل کے کھیلتے ہیں۔ دنیا کے مختلف مما لک میں مختلف کھیلوں کو اہمیت حاصل ہے۔ افریقہ اور یوروپ میں فٹ بال کو انتہائی اہم کھیل مانا جاتا ہے، کبڈی، ٹینس، کرکٹ اور دیگر کھیلوں کو دنیا کے مختلف گوشوں میں کھیلا جاتا ہے اور کھیلنے والے کھلاڑیوں کو مثالی شخصیت مانا جاتا ہے۔

ہمارے ملک بھارت میں کرکٹ کو کافی اہمیت دی جاتی ہے۔ کرکٹ شریفوں کا کھیل سمجھا جاتا ہے۔ کرکٹ میں گیارہ کھلاڑی ایک ٹیم سے میدان میں موجود ہوتے ہیں اور گیارہ کھلاڑی حریف ٹیم کے ہوتے ہیں۔ تاہم بیک وقت

بائیس کھلاڑی میدان میں کبھی نہیں ہوتے ، بلکہ صرف تیرہ کھلاڑی میدان میں بیک وقت ہوتے ہیں بعدازاں اس تعداد میں ایک کھلاڑی کا اضافہ ہوجاتا ہے جب بلے بازی کرنے والے کسی کھلاڑی کے چوٹ لگتی ہے اور وہ دوڑ کر رن لینے میں تکلیف محسوس کرتا ہے تو اس کے رنر کے روپ میں ایک کھلاڑی کا اضافہ ہوتا ہے۔میدان پر پچھے لکڑی کے ڈانڈے استعمال ہوتے ہیں، تین بلے باز کی طرف لگائے جاتے ہیں اور تین ڈانڈے گیند باز کی جانب زمین میں گاڑ دیے جاتے ہیں۔لکڑی کے یہ ڈانڈے اسٹمپ کہلاتے ہیں۔گیند باز کی گیند جب بلے باز کی جانب والے اسٹمپ پر ٹکراتی ہے تو بلے باز کو میدان سے باہر جانا پڑتا ہے اسے ''آؤٹ'' ہونا کہتے ہیں۔بلے باز کی جانب والے اسٹمپ کے پیچھے جو کھلاڑی ہوتا ہے اسے وکٹ کیپر کہتے ہیں۔میدان میں کھلاڑیوں کے ساتھ دو اور اشخاص موجود ہوتے ہیں۔ایک شخص گیند باز کی جانب کھڑا رہتا ہے اور ایک شخص بلے باز کی بائیں جانب ذرا فاصلے پر کھڑا رہتا ہے۔یہ دونوں اشخاص امپائر کہلاتے ہیں۔ایک اور امپائر ہوتا ہے جو میچ کو ٹی وی پر دیکھتا ہے اور وقت ضرورت اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔یہ امپائر میچ کے دوران فیصلوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

کرکٹ تین فارمیٹ میں کھیلا جاتا ہے۔ٹیسٹ ، یک روزہ اور ٹوینٹی ٹوینٹی۔تینوں فارمیٹ کے عالمی سطح کے مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔ٹیسٹ کرکٹ پانچ دنوں کا کھیل ہوتا ہے،اس میں چار اننگز ہوتی ہیں،اووروں کی کوئی قید نہیں ہوتی۔اوور وہ چھے گیندیں ہوتی ہیں جنھیں گیند باز ایک مخصوص انداز میں بلے باز کی جانب پھینکتا ہے۔یک روزہ کھیل میں پچاس اوورز ہوتے ہیں۔کل ملا کر ایک میچ میں سو اوورس کی گیند بازی ہوتی ہے۔ٹی ٹوینٹی کھیل میں ایک ٹیم بیس اوورس کھیلتی ہے اور کل ملا کر چالیس اووروں کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔دنیا میں کئی مما لک ہیں مگر حیرت انگیز طور پر کرکٹ کا کھیل صرف چند مما لک ہی کھیل پاتے ہیں۔ان میں بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش،سری لنکا،افغانستان،انگلینڈ، نیوزی لینڈ،آسٹریلیا، ویسٹ انڈیز، ساوتھ افریقہ،زمبابوے،کینیا،آئرلینڈ جیسے چنندہ مما لک شامل ہیں۔یکروزہ میچوں کے تاحال بارہ عالمی مقابلے ہوئے ہیں۔انھیں ورلڈ کپ کہتے ہیں۔پہلا ورلڈ کپ ۱۹۷۵ء میں کھیلا گیا،جس میں ویسٹ انڈیز ٹیم فاتح رہی،دوسرا ورلڈ کپ ۱۹۷۹ء میں کھیلا گیا اور اس بار بھی ویسٹ انڈیز ٹیم فاتح رہی۔تیسرا ورلڈ کپ ۱۹۸۳ء میں ہوا جس میں دوبار کی ورلڈ کپ فاتح ویسٹ انڈیز ٹیم کو بھارت کی کرکٹ ٹیم نے شکست دے کر فاتح کا خطاب اپنے نام کیا۔چوتھا ورلڈ کپ ۱۹۸۷ء میں منعقد ہوا۔اور اس بار آسٹریلیا فاتح ٹیم رہی، ۱۹۹۲ء میں ہونے والے کرکٹ ورلڈ کپ میں پاکستان ٹیم نے جیت درج کی۔۱۹۹۶ء میں ہوئے ورلڈ کپ میں سری لنکا نے کپ اپنے نام کیا،اس کے بعد ہوئے مسلسل تین ورلڈ کپ یعنی ۱۹۹۹ء، ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۷ء میں آسٹریلیا فاتح رہی،۲۰۱۱ء کا ورلڈ کپ بھارت نے جیتا،۲۰۱۵ء میں پھر سے آسٹریلیا نے جیت درج کی اور ۲۰۱۹ء میں انگلینڈ نے پہلی بار عالمی خطاب اپنے نام کیا۔آئندہ

کا ورلڈ کپ ۲۰۲۳ء میں منعقد ہونے جا رہا ہے۔

ٹی ٹیونٹی ورلڈ کپ کی شروعات بھی ہو چکی ہے۔ ۲۰۰۷ء میں ہوئے پہلے ٹی ٹیونٹی ورلڈ کپ میں بھارت فاتح ٹیم رہی، ۲۰۰۹ء میں ہوئے ورلڈ کپ میں پاکستان ٹیم نے خطاب جیتا تھا، ۲۰۱۰ء میں ہوئے تیسرے ورلڈ کپ میں انگلینڈ فاتح ٹیم رہی، ۲۰۱۲ء میں ویسٹ انڈیز نے خطاب جیتا، ۲۰۱۴ء میں سری لنکا نے جیت درج کی، اور ۲۰۱۶ء کے ورلڈ کپ میں ویسٹ انڈیز ٹیم نے دوسری بار خطاب جیتا۔ ورلڈ کرکٹ کے انتظامات سنبھالنے والی تنظیم آئی سی سی نے اس بار ٹیسٹ میچوں کا ورلڈ کپ قسطوں میں منعقد کیا ہے، بھارت پہلے ہی اس کے آخری اور فیصلہ کن میچ میں جگہ بنا چکا ہے، اس کا مقابلہ نیوزی لینڈ سے ہوگا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ کون سے عناصر مضمون نگاری کے لیے لازمی متصور ہوتے ہیں؟

۲۔ ضروری اجزائے انشا کون سے ہیں؟

۳۔ آسان موضوع پر مضمون لکھنے کی مشق سے کیا ہوگا؟

۴۔ مضمون نگاری میں ''ذیلی عنوانات'' کس طرح فائدہ مند ہوتے ہیں؟

1.4 محاورے

مستند لغت ''فرہنگ آصفیہ'' میں محاورے کی ایک معنی ہم کلامی، باہمی گفتگو، بول چال، بات چیت، سوال جواب دیا ہے اور دوسری یعنی اصطلاحی معنی وہ کلمہ یا کلام جسے چند ثقات نے لغوی معنی کی مناسبت یا غیر مناسبت سے کسی خاص معنی کے واسطے مختص کر لیا ہو، دیا ہوا ہے۔

دو یا اس سے زیادہ لفظوں کا وہ مجموعہ جو مصدر سے مل کر، اپنے حقیقی معنی سے ہٹ کر مجازی معنی میں بولا یا استعمال کیا جاتا ہے محاورہ کہلاتا ہے۔ محاورے زبان کو چست اور جاندار بنانے میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ محاوروں کو زبان کا ذائقہ سمجھا جاتا ہے۔ زبان کی لذت کا احساس محاوروں سے ہوتا ہے۔ محاورے بننے کا عمل غیر محسوس طور پر جاری رہتا ہے۔ محاورے جن لفظیات میں ملبوس ہوتے ہیں، بظاہر معنی ان سے مختلف یا ماورا رکھتے ہیں۔ محاوروں کی بنیاد عوام کے درمیان واقعات، تجربات اور حادثات سے پڑتی ہے۔ محاورہ دو یا دو سے زیادہ لفظوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ محاورے میں استعمال ہونے والے الفاظ اپنی اصل معنی کے علاوہ دوسرے مفہوم کے لیے بھی آزاد ہوتے ہیں۔ جیسے ''دل باغ باغ

ہونا''، یہ محاورہ لغوی اعتبار سے جس منظر کی نشان دہی کرتا ہے اس جانب ہماری توجہ فوراً ملتفت ہوتی ہے مگر محاورے میں اس کا مطلب مختلف ہوگا۔ جب کوئی محاورہ تخلیق ہوتا ہے اور اس کا چلن شروع ہوجاتا ہے، اسے اعتبار حاصل ہوجاتا ہے تب اس کے الفاظ میں ردو بدل نہیں کیے جاسکتے۔ ان کو جیوں کا تیوں استعمال میں لانا ہوتا ہے۔ جیسے ''پاؤں بھاری ہونا''۔ یہاں ''پاؤں'' کے علاوہ کسی اور جسمانی عضو کا استعمال محاورے کی معنی بدل دے گا۔ گنتی کے محاورے میں ''دو دو ہاتھ ہوجانا''، یہاں بھی تعداد بدلنا ممکن نہیں۔ دو کی جگہ تین نہیں لکھا جاسکتا اور نا ہی جملے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

محاورے زندگی کے تقریباً ہر شعبہ ہائے حیات سے منسلک وضع کیے گئے، نیز کارخانہ قدرت کی نسبتاً ہر شئے محاوروں کی زد میں آئی ہے۔ مردوں سے مخصوص محاورے، عورتوں سے متعلق محاورے، اعضائے جسمانی کے محاورے، نباتات سے منسلک محاورے، جانوروں (پالتو اور جنگلی) سے متعلق محاورے، پرندوں کے محاورے، آسمانی دنیا کے محاورے، زمین سے جڑے محاورے، علم طب سے متعلق محاورے، علم نفسیات سے منسلک محاورے، جسمانی ساخت کو ظاہر کرتے ہوئے محاورے، سونے سے متعلق محاورے، بیداری کے محاورے، پانی کے تعلق سے محاورے وغیرہ وغیرہ محاورے روزمرہ زندگی میں استعمال ہوتے ہیں اور نہ صرف زبان میں مٹھاس گھول دیتے ہیں بلکہ تجربات سے آگاہ بھی کرتے ہیں۔

زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہے۔ خیال مثبت بھی ہوسکتا ہے منفی بھی۔ چونکہ محاورے زبان کے بدن پر ملبوس ہوتے ہیں، لہٰذا یہ بھی مثبت اور منفی اثرات کے غماز ہوتے ہیں۔ نیز انکاری، اقراری اور استعجابی محاورے بھی چلن میں ہوتے ہیں۔ طربیہ اور رزمیہ معنوی ساخت کے محاورے بھی تقریباً ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔ طنزیہ اور مزاحیہ نوعیت کے محاوروں کا بھی اپنا مقام ہے۔ مختلف جذبات کی نمائندگی کرنے والے متعدد محاورے زبان کی چاشنی میں اضافہ کرتے ہیں۔ خاموشی کو ظاہر کرنے والے محاورے، شور کے متعلق محاورے، غصے کو ظاہر کرنے والے محاورے، خوشی کو ظاہر کرنے والے محاورے، غم کے اظہار کے محاورے، رشتوں کے محاورے، کاروبار کے محاورے، کھیل وتفریح کے محاورے۔ غرض محاوروں کی ابدی زندگی کے لیے بیشمار مواقع دستیاب ہیں۔

1.4.1 مشقی محاورے

ذیل میں ہم مختلف نوعیت کے مختلف محاوروں کو سمجھنے اور ان کو جملوں میں استعمال کرنے کی مشق کریں گے۔

سبز باغ دکھانا: فریب دینا، جھوٹے وعدے سے پھسلانا

بیت: ؎ ہم پہ بھی رنگ جمانے لگے ماشاءاللہ سبز باغ اب تو دکھانے لگے ماشاءاللہ

نثر: سیاست داں نے انتخابات کے دوران مہنگائی کو قابو کرنے اور ضروری اشیاء کی قیمتوں کو کم کرنے کی یقین دہانی

کرائی، مگر انتخابات کے بعد جب سیاست دان بڑی جیت کے ساتھ اقتدار پر قابض ہو گیا تو اس نے مہنگائی مزید بڑھادی اور ضرورت کی اشیاء کی قیمتوں کو کم نہیں کیا۔ دراصل اس نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے عوام کو سبز باغ دکھائے تھے۔

آب آب کرنا: پانی پانی کرنا، شرمندہ کرنا، لاج دلانا

بیت: ؎ ہوتی ہے چشم تر سے صدف غرقِ بحرِ شرم اشک آب آب کرتے ہیں درِّ یتیم کو

نثر: (۱) معاشرے میں سفید پوش بن کر پھرنے والے شیخ صاحب کو جب پولیس نے غیر قانونی کام کرتے ہوئے پکڑا اور انھیں سر عام بیڑیاں پہنادی گئیں تو ان کے ضمیر نے انھیں آب آب کر دیا، وہ منہ چھپائے ہوئے تھانے گئے۔

(۲) اپنے بچوں کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے سیٹھ دھنا جی کو ایک فقیر کی یہ بات آب آب کر گئی کہ آپ تو مجھ سے بھی زیادہ حاجت مند ہیں، آپ کی اولاد خود آپ کی عزت نہیں کر رہی ہے، دولت کس کام کی؟

آبدیدہ ہونا: آنکھوں میں آنسو بھر لانا، رنجیدہ ہونا، چشم نم ہونا

بیت: ؎ نزع کے وقت دکھایا مری الفت نے اثر آبدیدہ وہ ہوئے دیکھ کے حالت میری

نثر: فسادات سے متاثر شخص کی بھیانک داستان سن کر محفل میں موجود ہر ذی روح آبدیدہ ہو گیا۔

بل نکالنا: سیدھا بنانا، سزا دینا، غرور ڈھانا

بیت: ؎ ہم نکالیں گے سن اے موجِ بلا بل تیرا اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

نثر: علاقے کے نئے پولیس انسپکٹر نے سارے غنڈوں کے بل نکال دیے۔ اب علاقے میں شانتی ہے۔

جان میں جان آنا: اطمینان ہونا، تسکین ہونا، تقویت پانا، خوشی حاصل ہونا

بیت: ؎ آجائے ابھی جان میں جاں، آؤ اگر تم تن ہجر میں بے جان ہے، اے یار ہمارا

نثر: ماں دیوانہ وار پولیس اسٹیشن میں ایک جگہ سے دوسری جگہ چکر لگا رہی تھی، حالانکہ انسپکٹر نے کہا کہ اس کے بچے کو ڈھونڈنے کے لیے پولیس کا ایک دستہ گیا ہوا ہے۔ وہ آجائے گا اور بچے کو لے کر آئے گا۔ لیکن ماں کو اطمینان

نہیں تھا، وہ بے چین تھی۔۔۔۔۔کچھ دیر کے بعد پولیس کی ٹیم ایک چھوٹے بچے کو لے کر پولیس اسٹیشن آئی۔ بچے کو دیکھنے کے بعد ماں اس کی طرف لپکی، یہ اس کا ایک گھنٹہ قبل بازار میں کھویا ہوا بچہ تھا اور صحیح سلامت تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ماں اور بچے کی جان میں جان آئی اور پولیس نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

سر پر اٹھانا: شور وغل برپا کرنا، اودھم مچانا، شور وغل سے عاجز کر دینا، برباد کرنا

بیت: ؎ فصل گل آئی چمن میں کہ قیامت آئی عندلیبوں نے اٹھایا ہے گلستاں سر پر

نثر: دسویں کی جماعت میں اردو پڑھا رہے استاد نے ازراہِ مذاق ایک لطیفہ کیا سنایا کہ طالب علموں نے پوری اسکول سر پر اٹھالی، یوں شور مچایا، یوں قہقہے لگائے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، اردو کے استاد خود بھی طلبا کے ساتھ قہقہے لگا رہے تھے، پرنسپل صاحب کو سختی کرنی پڑی تب کہیں جا کر طلبا خاموش ہو گئے۔

گل کِھلانا: پھولوں سے مزین کرنا، نیرنگی دکھانا، شگوفہ کھلانا

بیت: ؎ زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نثر: (۱) مالی کی بہترین دیکھ بھال اور مالک کے اشتیاق نے چمن میں نت نئے گل کھلائے ہیں۔

(2) جس سے امید نہیں تھی کہ وہ دھوکہ دے گا اسی نے اندھیرے میں رکھ کر نئے گل کھلائے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ فرہنگ آصفیہ میں محاورے کے کیا معنی دیے ہوئے ہیں؟

۲۔ محاورہ کی تعریف کیا ہے؟

۳۔ محاورہ ''سبز باغ دکھانا'' کی معنی لکھ کر اپنے جملے میں استعمال کیجیے۔

1.5 خلاصہ

مضمون نگاری بنیادی طور پر ذاتی خیالات کو عام کرنے یا موجود معلومات کو مشتہر کرنے کا ایک تحریری آلہ ہے۔ جس میں مناسبت لفظی، موزونیِ عنوان اور مناسب تراکیب اہمیت رکھتے ہیں۔ کامیاب مضمون اپنے موضوع کو اس طرح قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے کہ قارئین نہ صرف اپنے علم میں اضافہ محسوس کرتے ہیں بلکہ تحریر کی شگفتگی کے سحر میں

گرفتار بھی ہو جاتے ہیں۔ اچھا مضمون رموز واوقاف کی پابندی کے ساتھ تحریر ہوتا ہے اور اس کے سمجھنے میں کوئی رکاوٹ درپیش نہیں ہوتی۔ مضمون نگاری اور تحریر کو دلچسپ بنانے والے محاوروں کے تعلق سے اس اکائی میں اہم معلومات دی گئی ہے۔ مضمون نگاری نہایت ذمہ داری کا تقاضا کرتی ہے۔ غیر ضروری تفصیلات سے گریز اور اہم موضوع پر گرفت اچھے مضمون کی نشانی ہوتی ہے۔ کم اور کارآمد الفاظ میں موضوع کو بیان کرنا ایک کامیاب مضمون نگار کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ عنوان، تمہید، نفس مضمون اور اختتام کی لڑی کو مناسب اور متاثر کن انداز میں صفحہ قرطاس پر اتارنا مضمون نگار کا فرض ہوتا ہے۔ مضمون میں رموز اوقاف مفہوم کی ترسیل میں آسانی پیدا کرتے ہیں۔ ان کا درست استعمال کرنا مضمون نگار کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ اچھے مضمون نگار کے لیے اپنے موضوع اور انداز پیش کش کے تعلق سے نہایت واضح نظریہ ہونا چاہیے تاکہ مضمون اپنے اصل مطالب کو بیان کرنے میں سہل رہے۔

محاورے تحریر کو مزیدار بناتے ہیں۔ محاوروں کی مرادف معنی کافی لطف دیتی ہے۔ اکثر محاورے اصطلاحی یا روزمرہ کی معنی سے مزیدار بنتے ہیں۔ مختصر الفاظ اور متاثر کن انداز میں اپنی بات کہنے میں محاورے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ محاوروں کے بغیر کوئی زبان متاثر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ محاورے راقم اور قاری کے درمیان خوشگوار تعلق قائم کرتے ہیں۔ محاورے زبان کی جان ہوتے ہیں۔ اکائی محاورے کے تعلق سے بھرپور تعارف پر مشتمل ہے۔

1.6 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ کون سے عناصر مضمون نگاری کے لیے لازمی متصور ہوتے ہیں؟

۲۔ ضروری اجزائے انشا کون سے ہیں؟

۳۔ آسان موضوع پر مضمون لکھنے کی مشق سے کیا ہوگا؟

۴۔ مضمون نگاری میں ''ذیلی عنوانات'' کس طرح فائدہ مند ہوتے ہیں؟

۵۔ سکتہ، وقفہ، رابطہ، ختمہ، واوین، قوسین وغیرہ کو کیا کہتے ہیں؟

6۔ نفس مضمون کی مناسبت سے مضمون کی قسمیں کون سی متعین کی گئیں؟

(ب) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

1۔ کسی ایک سیاسی شخصیت پر مضمون لکھیے۔

2۔ کسی کھیل کے تعلق سے مضمون قلم بند کیجیے۔

3۔ سردی کے موسم پر ایک معلومات افزا مضمون لکھیے۔

4۔ اپنی پسند کی ادبی شخصیت پر ایک مکمل مضمون قلم بند کیجیے۔

1.7 فرہنگ

مستعار	:	ادھار لیا ہوا، مانگا ہوا
مشاق	:	مہارت، دسترس
ادراک	:	عقل، سمجھ
تطابق	:	باہم مطابق ہونا، مشابہت
مرصع سازی	:	آراستہ کرنے کا کام
مترادفات	:	مترادف کی جمع، ہم معنی
متقاضی	:	تقاضا کرنے والا، مطالبہ کرنے والا
مطابقت	:	برابری، مشابہت
ثقات	:	ثقہ کی جمع، معتبر لوگ
ممد	:	مدد کرنے والا، مددگار
ملتفت	:	التفات کرنے والا، توجہ کرنے والا
غماز	:	اشارہ کرنے والا
شگفتگی	:	پھول کا کِھلنا، شادابی
سرخ رو	:	کامیاب ہونا، عزت پانا
توضیح	:	تشریح، وضاحت

1.8 معاون کتابیں

۱۔	مضمون نگاری	:	علامہ اخلاق دہلوی
۲۔	فن مضمون نگاری	:	فہیم الدین نوری
۳۔	فن مضمون نگاری	:	آفتاب اظہر صدیقی
۴۔	مضمون نویسی	:	عشرت لکھنوی
۵۔	اردو مضمون کا ارتقا	:	سیدہ جعفر
۶۔	مضمون نگاری	:	محمد فضل اللہ خان
۷۔	اردو محاورے	:	فخر الدین صدیقی اثرؔ
۸۔	ہندوستانی محاورے	:	پروفیسر محمد حسن
۹۔	ہمارے محاورے	:	سیفی پریمی
۱۰۔	دہلی کے محاورے	:	سید ضمیر حسن

☆☆☆

اکائی: 2 ۔ میر امن دہلوی، سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد

ساخت:

2.1 اغراض و مقاصد

2.2 تمہید

2.3 میر امن دہلوی

2.3.1 میر امن دہلوی : حیات

2.3.2 میر امن دہلوی کی ادبی خدمات

2.4 سرسید احمد خان

2.4.1 سرسید احمد خان : حیات

2.4.2 سرسید احمد خان کی ادبی خدمات

2.5 ڈپٹی نذیر احمد

2.5.1 ڈپٹی نذیر احمد : حیات

2.5.2 ڈپٹی نذیر احمد کی ادبی خدمات

2.6 خلاصہ

2.7 نمونۂ امتحانی سوالات

2.8 فرہنگ

2.9 معاون کتابیں

2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں میر امن دہلوی کے سوانحی کوائف پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی۔نیز ان کی ترجمہ نگاری کی خصوصیات کواجاگر کیاجائے گااوران کی اسلوب نگاری پرخصوصی تبصرہ کیاجائے گا تا کہ آپ ان کی اندازِتحریر سے واقفیت حاصل کرسکیں اوران کےاسلوب کی خوبیوں سےلطف اندوز ہوسکیں۔ساتھ ہی ساتھ سیداحمد خان کی زندگی کےمختلف گوشوں کا جائزہ لیا جائے گا۔ان کی شخصیت کامختصر خاکہ پیش کیاجائے گانیز ان کی نثر نگاری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے اسلوب پر بھی تبصرہ کیاجائے گا۔ان کی مکتوب نگاری پر بھی سیر حاصل گفتگو ہوگی تا کہ آپ ان کی تحریر کےمحاسن سےفیض یاب ہوسکیں۔علاوہ ازیں نذیر احمد کی حیات پر بھی مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی۔ان کی ناول نگاری کی خصوصیات پر بحث ہوگی نیز ان کی ناول نگاری کےمختلف پہلوؤں پرسیر حاصل تبصرہ کیاجائے گا تا کہ ان کی اسلوب نگاری کی خوبیوں کواجاگر کیاجاسکے۔

2.2 تمہید

میر امن دہلوی ترجمہ نگاری کی دنیا میں ایک ممتاز شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔فورٹ ولیم کالج نے ترجمہ نگاری کے لیے کئی مصنفین کی خدمات حاصل کیں۔ان میں میر امن کا نام ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔'باغ وبہار' ان کا بہترین کارنامہ ہے جس کی اہمیت مسلّم ہے۔گوکہ یہ ان کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے۔گویا یہ اردو افسانے کی صبح کاذب ہے۔اس میں دلی کی تہذیب ومعاشرت کی مکمل مرقع کشی نظر آتی ہے۔

جہانِ اردو میں سرسید احمد خان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔اردو ادب کی سب سے اول اور ہمہ گیر تحریک 'علی گڑھ تحریک' ہےجس کے بانی سرسید احمد خان ہیں۔وہ اردوادب کی ممتاز ومنفرد شخصیت کےطور پر جانے جاتے ہیں۔انھیں مسلمانوں سے کافی انس رہا ہے۔وہ مسلمانوں کی بھلائی وبہبود کے لیے تاعمر کوششیں کرتے رہے۔انھوں نے مسلمانوں کے لیے اصلاحی تحریک کوفروغ دیا۔انھوں نے کئی کارنامے انجام دیے ہیں جن میں علی گڑھ کالج کا قیام بھی ہے جوعصرِ حاضر کی جامعہ علی گڑھ ہے۔علاوہ ازیں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام بھی سرسید احمد خان کارہینِ منت ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا نام اردو ناول نگاری میں ایک معتبر نام ہے۔جب بھی اردو ناول نگاری کی ابتدا کےتعلق سے بات کی جاتی ہےان کے ناول 'مراۃ العروس' کا تذکرہ ضرور کیا جاتا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں نہایت سادگی کے ساتھ اسلامی معاشرت اوربطور خاص مسلمانوں کی طرزِ زندگی کا خوب صورت خاکہ پیش کیا ہے۔

2.3 میر امن دہلوی

2.3.1 میر امن دہلوی : حیات

میر امن دہلوی کے نام کے ساتھ 'باغ و بہار' کا ذکر ضرور آتا ہے گو کہ یہ ان کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ میر امن کی داستانوی کتاب ہے جو کہ جان گلکرسٹ کی فرمائش پر تحریر کی گئی تھی۔ اردو زبان میں ترجمہ ہونے سے پہلے یہ فارسی زبان میں 'قصہ چہار درویش' کے نام سے مقبول تھی۔ یہ داستان اردو نثر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ داستان ایک طویل کہانی ہے جو نہایت تسلسل کے ساتھ ایک کے بعد ایک قصوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہے اور زیادہ تر مافوق الفطرت عناصر کا ذکر اس میں شامل ہوتا ہے جس کا پلاٹ بے حقیقت اور مختلف تصورات سے پُر ہوتا ہے جو واہمہ پر منحصر ہوتا ہے اور اس کا ہیرو نہایت طاقتور اور بہادر ہوتا ہے جو اپنی حکمتِ عملی سے ہر محاذ پر کامیابی حاصل کرتا ہے۔ کلیم احمد داستان کے تعلق سے رقم طراز ہیں کہ ''داستان کہانی کی طویل، پیچیدہ اور بھاری بھرکم صورت ہے۔''

داستانوں میں طوالت اور تسلسل اس کی خاص صفت ہے جو مختصر قصوں سے مل کر ایک طویل قصے کو جنم دیتی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے قصے داستان کا جزو بنتے ہیں۔ اسی کے سہارے داستان آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس کا مرکزی کردار ہمیشہ فاتح اعظم کی طرح ہر محاذ پر ظفریاب ہوتا ہے۔

گیان چند جین نے داستان کے لغوی معنی قصہ، کہانی اور افسانہ بتایا ہے۔ وہ منثور بھی ہوسکتا ہے اور منظوم بھی۔ اس میں تفریح طبع کے مختلف پہلو ملتے ہیں۔ داستان کی دنیا طلسم وسحر کی دنیا ہے جہاں قدم قدم پر عجائب نگاری کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔ دیو، جن، پری اور بھوت کے ذریعے کہانی کو رنگین بنایا جاتا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پُر اسرار واقعات سے داستان کی فضا معمور ہوتی ہے۔ داستان کے موضوعات عام طور پر عشقیہ وتفریحی ہوتے ہیں۔ داستان کی تکنیک میں تہذیبی، اخلاقی، مذہبی اور دیگر مسائل کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں عالمانہ، اخلاقی، مذہبی باتوں پر زور دیا جاتا ہے۔ داستان کی اصل غایت اس کی کہانی یا قصہ ہے۔ دیگر مسائل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسے عام طور پر تفریح طبع کے لیے لکھا گیا ہے۔ حقیقی زندگی سے فرار اور تخیل کے سہارے خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ داستان ہے جس کی فضا ذہنی وقلبی سکون حاصل کرنے کا موجب بنتی ہے۔ 'باغ و بہار' بھی اسی طرح کی داستان ہے جسے میر امن دہلوی نے فارسی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔

میر امن دہلوی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ہمیں صرف اتنا ہی علم ہے جتنا خود میر امن نے 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے نام کے تعلق سے بھی اختلاف رہا ہے۔ بعض نے میر امن نام اور تخلص 'امن' بتایا ہے جب کہ بعض نے تخلص 'لطف' لکھا ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا نام میر امن اور تخلص 'لطف' تھا۔

میر امن کی کتاب 'باغ و بہار' کے دیباچے سے ان کے حالاتِ زندگی کا مختصر خاکہ اس طرح منظر عام پر آتا ہے کہ انھیں میر امن دلی والا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کے بزرگ ہمایوں کے عہد میں ہندوستان میں وارد ہوئے اور شاہ عالم گیر ثانی کے عہد حکومت تک دربار سے وابستہ رہے اور ''خانہ زاد موروثی و منصب دار قدیمی'' کہلائے۔ جب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو مضبوط کیا اور احمد شاہ ابدالی نے دلی کو تباہ و تاراج کیا تو میر امن کے گھر بار کا نقشہ بھی بگڑ گیا۔ حالات سنگین ہوتے چلے گئے اور انھیں دلی سے جلاوطن ہو کر عظیم آباد میں پناہ لینی پڑی۔ یہاں پر بھی روزگار کی کوئی سبیل نظر نہیں آئی تب میر امن اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر تنِ تنہا کلکتہ کی جانب روانہ ہوئے۔ کچھ دنوں یہاں بھی بے کاری کی حالت میں گزارنے پڑے۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے انھیں چھوٹے میر محمد کاظم خان کا اتالیق مقرر کر دیا۔ قریب دو سال کا عرصہ اس طرح گزر گیا۔ بعد ازیں میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے سربراہ جان گلکرسٹ سے کروایا۔ یہاں انھیں ملازمت مل گئی۔

جن تاریخی واقعات کا ذکر میر امن نے 'باغ و بہار' کے دیباچے میں لکھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ جنوری ۱۷۵۷ء سے جنوری ۱۷۶۱ء تک کا زمانہ دہلی کے باشندوں کے لیے بڑی تکلیف اور بے پناہ مصیبت کا زمانہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی والے لٹتے اور تباہ ہوتے رہے اور دہلی کو چھوڑ چھوڑ کر دوسرے شہروں میں پناہ گزیں ہوتے رہے۔ احمد شاہ ابدالی کی فوجیں واپس لوٹیں تو رہی سہی کسر سورج مل جاٹ نے پوری کر دی۔ قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ دسمبر ۱۷۶۳ء تک سورج مل جاٹ کی موت تک چلتا رہا۔

بہر حال میر امن ۱۸۰۰ء کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے۔ ملازمت کے دوران انھوں نے دو کتابیں 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' مکمل کی۔ 'باغ و بہار' ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوئی اور ۱۸۰۶ء تک 'گنج خوبی' بھی تکمیل کو پہنچی۔

۴ر جنوری ۱۸۰۶ء کو ہندوستانی شعبے کے ایک پروفیسر نے کالج کونسل میں شکایت درج کروائی کہ میر امن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کر دیا ہے۔ کالج کونسل نے انھیں اس ضمن میں جواب دہی کے لیے بلایا۔ جب وہ کالج کونسل کے سامنے حاضر ہوئے تو انھوں نے اپنی طویل عمری اور ناتوانی کا جواز پیش کیا۔ ان کا بیان سننے کے بعد کالج کونسل نے اندازہ لگایا کہ میر امن کالج کی خدمات سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں لہٰذا انھیں اس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ چار مہینوں کی مزید تنخواہ دے کر کالج کی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد ان کے حالاتِ زندگی کسی کتاب یا تذکرے میں نہیں ملتے۔ البتہ ان کے بیان کے مطابق اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کثیر العیال تھے۔ ان کے خاندان میں چھوٹے بڑے دس افراد موجود تھے جو ان کے کلکتہ آنے کے بعد ان کے پاس آ گئے تھے۔ انھوں نے 'باغ و بہار' ارو 'گنج خوبی'

دونوں کی غایت تالیف میں پرورش اطفال کا تذکرہ کیا ہے۔سبکدوشی کے وقت ان کی عمر کیا تھی اس بات کا کوئی واضح اشارہ موجود نہیں ہے۔قرینِ قیاس ہے کہ اس وقت وہ ۷۰ سال سے کم نہیں تھے۔ہوسکتا ہے دوایک برس بعد ان کا انتقال ہو گیا ہو البتہ ان کی ولادت، وفات اور مدفن کے تعلق سے کسی کو صحت کے ساتھ کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ میر امن دہلوی کہاں کے رہنے والے تھے؟
۲۔ ان کی تصانیف میں کون سی دو کتابیں شامل ہیں؟
۳۔ میر امن کو فورٹ ولیم کالج سے کیوں سبکدوش ہونا پڑا؟
۴۔ میر امن دہلی سے کیوں کوچ کر گئے؟

2.3.2 میر امن دہلوی کی ادبی خدمات

میر امن نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران دو کتابوں کے ترجمے کیے۔ان میں ایک 'باغ و بہار' اور دوسری 'گنج خوبی' شامل ہے۔ان دو تالیفات کے علاوہ ان کی کوئی تیسری کتاب نہیں ملتی۔'باغ و بہار' میر امن کا وہ کارنامہ ہے جو ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ان کی یہ تصنیف فارسی کے ایک بے حد مقبول قصے 'قصہ چہار درویش' کا ترجمہ ہے جسے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر تحریر کیا گیا۔میر امن نے شاعری میں اپنا تخلص 'لطف' لکھا ہے لیکن کسی معاصر یا بعد کے تذکرے میں ان کے اشعار کا بھی کوئی علم نہیں ہے۔

'باغ و بہار' کی تازگی اور ندرت میں وہ کشش ہے کہ دوسو سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی قارئین اس کتاب کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔اس کی ایک وجہ ان کی سادہ نثر ہے جو عام بول چال کی زبان رہی ہے۔حالانکہ 'باغ و بہار' کی تکمیل سے تیس برس پہلے میر محمد حسن عطا خان تحسین 'قصہ چہار درویش' کو فارسی سے اردو میں منتقل کر چکے تھے۔تحسین نے اس کتاب کا نام 'انشائے نوطرز مرصع' رکھا تھا۔میر امن نے اسی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے 'باغ و بہار' کی تالیف فرمائی جو داستان سے تعلق رکھتی ہے۔داستان ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔ادب میں نثری قصوں کی وہ قسم جس کے کردار مثالی ہوں اور جس کی بنیاد خیال آرائی پر مبنی ہو اور جس میں مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار ہو، داستان کہلاتی ہے۔جس کی زبان میں تکلف سے کام لیا جاتا ہے۔اکثر داستانوں کے ماخذ عربی، فارسی، سنسکرت قصے ہیں۔اردو ادب میں داستان کی ابتدا دکن سے ہوتی ہے اور اردو کی سب سے پہلی داستان 'سب رس' مانی جاتی ہے جو کہ ملا وجہی کی

تصنیف کردہ ہے۔شمالی ہند میں قصہ مہر افروز دلبر،نوطرز مرصع ،ملک محمد وگیتی افروز،جذبِ عشق اور عجائب القصص جیسی داستانوں کا وجود ہوا۔

جب فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑی تو اس کے قیام نے اردو میں ’باغ و بہار، داستانِ امیر حمزہ، آرائشِ محفل، سنگھاسن تیسی، بیتال پچیسی وغیرہ داستانیں عطا کیں۔اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے باہر بھی کئی داستانیں وجود میں آئیں جن میں رانی کیتکی کی کہانی (انشا اللہ خان انشا)،فسانۂ عجائب (رجب علی بیگ سرور) وغیرہ شامل ہیں۔جہاں تک میر امن کی ’باغ و بہار‘ کا تعلق ہے اس کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور عام بول چال کے قریب ہے جسے جان گلکرسٹ کی ہدایت پر تصنیف کیا گیا۔

میر امن کے بیان کے مطابق ’باغ و بہار‘۱۲۱۵ھ (ہجری) کے آخر سال میں اس کی ابتدا ہوئی اور ۱۲۱۷ھ کی ابتدا میں تکمیل کو پہنچی۔رشید حسن خان ’باغ و بہار‘ میں اس طرح گویا ہیں :

> ’’میر امن کے مطابق باغ و بہار اچھا نام ہے کہ ہم نام وہم تاریخ اس میں نکلتی ہے۔
> تب میں نے یہی نام رکھا۔‘‘

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار
تھی سنہء بارہ سو ستر در شمار
کرو سیراب اس کی تم رات دن
کہ ہے نام و تاریخ ’باغ وبہار‘

’باغ و بہار‘ میں ایک بادشاہ اور چار درویش کی کہانیاں ہیں جنھیں تمہید اور خاتمے کے ذریعے آپس میں جوڑ دیا گیا ہے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ داستان نہ ہوتے ہوئے پانچ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔اس میں خاص بات یہ ہے کہ اس کتاب میں دہلی کی تہذیب ومعاشرت کی مکمل عکاسی ملتی ہے۔میر امن کو زبان پر قدرت حاصل ہے اور وہ محاوروں کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔کہیں پر وقت اور کہیں بے وقت اس میں کچھ الفاظ ایسے بھی شامل ہیں جو لغت کے لحاظ سے نا مناسب ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ عوام کی زبان پر رائج تھے۔

فارسی رسم الخط کے علاوہ ’باغ و بہار‘ لاطینی، ہندی اور گجراتی رسم الخط میں بھی شائع ہوئی۔علاوہ ازیں یورپ کی مختلف زبانوں میں بھی اس کے متعدد ترجمے ہوئے۔اس کتاب کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب ’گنج خوبی‘ بھی ہے۔یہ کتاب ملا حسن واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ’اخلاق محسنی‘ کا ترجمہ ہے۔اس کتاب کو زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی۔اس کی اشاعت کے تعلق سے یہ قیاس ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۰۶ء میں تصنیف ہوئی اور اسی سال میر امن کو اپنی ملازمت

سے سبکدوش ہونا پڑا۔

اپنے مطالعہ کی جانچ

۱۔ میر امن دہلوی کی تصنیفات کے نام بتائیے۔

۲۔ 'باغ و بہار' فارسی کی کس کتاب کا ترجمہ ہے؟

۳۔ میر امن دہلوی کس کالج سے وابستہ تھے؟

۴۔ 'باغ و بہار' کس کی فرمائش پر تصنیف کی گئی تھی؟

2.4 سر سید احمد خان

2.4.1 سر سید احمد خان : حیات

سر سید احمد خان ہندوستان کی وہ مایۂ ناز شخصیت ہیں جن کی مثالیں اس دنیا میں بہت کم ملتی ہیں۔ یوں کہیے کہ اردو نثر پر ان کا احسان ہے اور خاص طور سے مسلمانوں کی فکر اور فلسفۂ زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالنے کا سہرا ان کے سر ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ ہندوستان ایک بڑے سیاسی بحران سے گزر رہا تھا، انگریزوں کا تسلط دہلی پر قائم ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے حکومت چھن چکی تھی۔ بڑی کسمپرسی کا عالم تھا۔ مسلمان دنیاوی علوم وفنون سے بے بہرہ ہو چکے تھے اور دن بہ دن تنزلی کا شکار ہو رہے تھے۔ پستی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ ایسے عالم میں مسلمانوں کو اس حالتِ زار سے باہر نکالنے کے لیے سر سید احمد خان نے انھیں تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی اور سائنس اور ٹیکنالوجی سے جڑنے کا مشورہ دیا۔

خیال کیجیے کہ سر سید احمد خان کا دور انیسویں صدی کا دور تھا۔ ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور ۷۰ سال کی عمر پائی۔ اس عہد میں سر سید احمد خان نے مستقبل میں آنے والی ضرورتوں کے پیش نظر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نہ صرف اظہار کیا بلکہ مسلمانوں کو گاہے بہ گاہے متنبہ کرتے رہے کہ انھیں اگر ترقی کی منزلوں پر قدم رکھنا ہے تو انہیں ادب کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیمات سے بھی مستفید ہونا پڑے گا۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے اپنی ۷۰ سالہ زندگی میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے اور بنا کسی مفاد کے سماجی اور فلاحی کام انجام دیتے رہے۔

سر سید احمد خان کے والد سید محمد تقی خان مغل دربار سے وابستہ تھے۔ انھوں نے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ سید احمد خان کی پرورش ان کے نانا خواجہ فرید کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ ان کی والدہ عزیز النساء ایک نیک اور رحم

دل خاتون تھیں۔سرسید احمد خان کی زندگی پر ان کی والدہ اور خاص طور سے نانا کے اثرات مرتب ہوئے۔ان کے والد نے بھی انھیں صوفیانہ روایت سے وابستہ کرنے میں ایک بڑا کردار ادا کیا۔گو یا کہ خاندانی روایات اور مذہبی افکار کے غیر معمولی اثرات ان کی زندگی پر اس طرح غالب ہوئے کہ آخر دم تک وہ ان کی شخصیت میں قائم رہے۔

ان کی والدہ امتیازی خوبیوں کی مالک تھیں۔رحم وسخاوت میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ایک مرتبہ کا واقعہ ہے ،کسی شخص نے سرسید کو کافی اذیت اور تکلیف پہنچائی۔سرسید احمد خان ان سے انتقام لینا چاہتے تھے۔جب اس بات کا علم ان کی والدہ کو ہوا تو انھوں نے سرسید احمد خان سے انھیں معاف کرنے کو کہا اور سرسید احمد خان نے انہیں معاف کر دیا۔انصاف پسندی کا یہ عالم تھا کہ گھر کے ملازمین کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے،اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔غرض کہ سرسید احمد خان کی پرورش ایک اعلیٰ وارفع خاندان میں ہوئی۔انھوں نے بڑے بڑے عالموں سے علم حاصل کیا اور شاعروں کی صحبت سے فیض اٹھایا۔بائیس سال کی عمر سے انھوں نے ملازمت کی تلاش شروع کردی۔انھیں آگرہ عدالت میں بطور نائب منشی مقرر کرلیا گیا۔انھوں نے برطانوی قوانین اور عدالتی کارروائیوں کا علم حاصل کیا۔اپنی محنت کے بل بوتے پر وہ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے اور صدر امین کے عہدے تک پہنچ گئے۔ان کا تبادلہ بجنور میں ہوا۔پھر اس کے بعد وہ مراد آباد میں صدرالصدور کی حیثیت سے تعینات کیے گئے۔مختلف شہروں میں ان کی تقرری ہوتی رہی۔غازی آباد اور بنارس میں بھی وہ مقیم رہے اور اپنی خدمات بہ حسن وخوبی انجام دیتے رہے۔برطانوی حکومت نے ۱۸۸۸ء میں انھیں ان کی بیش بہا خدمات کے عوض ''سر'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔

وہ جہاں جہاں اور جس جس شہر میں گئے،مسلمانوں کی حالت زار اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔قوم کی تنزلی اور بے کسی نے انھیں بے چین کر دیا۔۱۸۵۷ء کی بغاوت کے نقصانات کے اثرات سب سے زیادہ مسلمانوں کو اٹھانے پڑے تھے۔انھیں اپنی قوم کو اندھیرے سے روشنی کی طرف لانے کے لیے ایک ہی راستہ سُجھائی دیا اور وہ راستہ نئی تعلیم کی منزل سے گزرتا تھا۔اس وقت کے مسلمان انگریزی تعلیم سے خائف تھے،اسے اختیار کرنے میں اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔سرسید احمد خان نے اس ضمن میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور قوم کے ذہن سے انگریزی علوم اور انگریزی زبان کی نفرت کو ختم کرنے کا نمایاں کردار ادا کیا۔۱۸۷۶ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔جدید نثر کے بانی اور تعلیمی تحریک کے علم بردار عظیم المرتبت سرسید احمد خان کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا۔وہ علی گڑھ کی جامعہ مسجد کے احاطے میں سپرد خاک ہوئے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ سرسید احمد خان کی پرورش کس ماحول میں ہوئی؟

۲۔ قوم کے حالات بدلنے کے لیے سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو کیا مشورہ دیا؟

۳۔ سرسید احمد خان کی والدہ کے کردار کا مختصر تعارف دیجیے۔

2.4.2 سرسید کی ادبی خدمات

جدید اردو نثر کے بانی کے طور پر سرسید احمد خان کی خدمات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جدید تعلیم کے محرک کے طور پر ان کی شخصیت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ انھوں نے ہندوستانیوں کی طرز فکر اور طرز تحریر کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو ادب میں علی گڑھ تحریک ایک ہمہ گیر تحریک کے روپ میں سامنے آتی ہے جس کا بیج سرسید احمد خان نے بویا اور اسے پروان چڑھانے میں دل وجان سے کوشش کی۔ آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں میں شامل ہے اور ملک کی تعمیر وترقی میں ممد ومعاون ہے۔

سرسید کے دل میں قوم کا درد موجود تھا۔ قوم کے حالات پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ اسے بدلنا چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے مسلمانوں سے تعلیم حاصل کرنے کی اپیل کی اور انگریزی تعلیم اور علوم وفنون پر بھی توجہ صرف کرنے کی تلقین کی۔ پہلی مخالفت مسلمانوں کی جانب سے ہی ہوئی مگر اس مصلح قوم نے ہمت نہ ہاری اور اپنے مشن میں کارہائے نمایاں کرتے ہوئے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔ سرسید احمد خان نے جب لندن کا سفر کیا تب انھوں نے انگریزوں کے حالات کا بغور مشاہدہ کیا اور ان کی تہذیب کو قریب سے دیکھا اور قائل ہو گئے۔ ان کی محنت اور ترقی سے بھی وہ کافی متاثر تھے۔ ان کے علم وادب اور درس وتدریس کی خوبیوں سے بھی وہ واقف ہو گئے۔ جب وہ لندن سے واپس لوٹے تو انھوں نے مضامین لکھنا شروع کیا۔ وہ لندن میں انگریزوں کے ایک اخبار سے کافی متاثر ہوئے تھے جس کے نتیجے میں یہ مضامین عمل میں آئے۔ پھر انھوں نے ایک پرچہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس میں ان کی انشائیہ نگاری کی بنیادیں استوار ہوتی نظر آتی ہیں۔ اس کا اداریہ وہ خود تحریر فرماتے۔ کبھی کبھی انگریزی میں بھی مضمون شائع کرتے۔ اس پرچے کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں لکھے گئے مضمون میں کہیں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا گیا بلکہ خیالات کو من وعن بیان کر دیا جاتا تھا اور یہی خوبی ایک سچے صحافی کی ہوتی ہے۔ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ سرسید احمد خان نے ایک ادیب اور ایک صحافی کی حیثیت سے اپنا لوہا منوالیا۔ تہذیب الاخلاق پر انگلیاں بھی اٹھائی گئیں باوجود مخالفت کے وہ اپنا کام کرتے رہے۔ انھوں نے کئی طبع زاد مضمون لکھے اور انگریزی مضامین کے ترجمے بھی کیے۔ ان کی انشائیہ نگاری اصلاحی ضرورتوں کی تکمیل کا وسیلہ بنی۔ وہ قوم کے خادم تھے۔ قوم کی فلاح کے لیے لکھتے۔ ان کے مضامین صرف سیر وتفریح طبع کے تحت نہیں لکھے گئے

تھے۔کئی مقاصد تھے جوان کے پیش نظر تھے اوران میں ایک بڑا مقصد اصلاح معاشرہ تھا۔ان کے انشایئے انکشافِ ذات کا بہترین نمونہ ہیں۔وہ اعمال انسانی پر توجہ کرتے ہیں۔کہیں کہیں ظرافت کے کچھ انداز بھی پائے جاتے ہیں۔وہ انجام حیات اورآخرت کے نفع وسود پر بھی بات کرتے ہیں اوراس کے لیے بحث اوراستدلال کا رویہ بھی اختیار کرتے ہیں۔

سرسید احمد خان کے بڑے بھائی دہلی سے ایک ہفت روزہ ''سیدالاخبار'' جاری کیا کرتے تھے۔جب ۱۸۴۵ء میں ان کے بھائی سید محمد خان فوت ہوگئے تو اُس اخبار کی ذمہ داری سرسید احمد خان نے اپنے کاندھوں پر لے لی۔وہ بھائی کی موت سے بہت دکھی تھے مگر زندگی کی اس کڑوی سچائی کو جھٹلا نہیں سکتے تھے۔کچھ عرصے بعد وہ نارمل ہوگئے اور ۱۹۴۷ء میں انھوں نے ایک کتاب'' آثارالصنادید'' تحریر کی۔آثارالصنادید دہلی کی قدیم تاریخی عمارتوں کے حوالے سے ایک قیمتی دستاویز ہے۔۱۸۵۹ء میں انھوں نے ''اسباب بغاوتِ ہند'' تحریر فرمائی جس میں غدر کے احوال درج ہیں۔۱۸۶۱ء میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا مگر انھوں نے عقدثانی نہیں کیا۔وہ پورے شدومد کے ساتھ قوم کی خدمت پر مامور ہوگئے۔۱۸۶۲ء میں ان کا تبادلہ غازی پور ہوگیا۔یہاں انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا اور سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔۱۸۶۴ء میں جب ان کا تبادلہ علی گڑھ میں ہوا تو انھوں نے انگریزوں کی مدد سے برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔علی گڑھ کے زمینداروں نے ان کی اس تحریک کو خوب سراہا۔یہاں انھوں نے ایک اخبار'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کا اجرا کیا۔وہ انگریز سرکار میں ملازم تھے اسی ناطے ان کے تبادلے مختلف شہروں میں ہوتے رہے۔۱۸۶۷ء میں جب وہ بنارس آئے تو یہاں انھوں نے ایک ہومیو پیتھک دواخانہ شروع کیا۔۱۸۶۹ء میں انھیں لندن جانے کا موقع ملا۔ان کے پاس لندن جانے کے لیے وافر سرمایہ موجود نہیں تھا۔انھوں نے اپنا ایک دواخانہ فروخت کردیا۔قرض بھی لیا اور لندن پہنچے۔یہاں آکر ان کی ملاقات کئی ادیبوں اور صحافیوں سے ہوئی۔وہ ان سے کافی متاثر ہوئے۔یہاں رہ کر انھوں نے ایک کتاب ''خطبات احمدیہ'' لکھی جو ایک انگریز ادیب کا جواب تھا جس نے اسلام کی تصویر مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔لندن سے لوٹنے پر انھوں نے '' تہذیب الاخلاق'' نامی پرچہ جاری کیا۔اس کا پہلا شمارہ ۲۴ردسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔۱۸۷۵ء میں انھوں نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان کی بنیاد ڈالی جس کی مخالفت کا انھیں سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری اور محمڈن اورینٹل کالج سے ہوتے ہوئے آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ہمارے سامنے ان کی ان تھک محنت وجہت کا نمونہ موجود ہے۔اسی یونیورسٹی سے بڑے بڑے ادیب ورہنمائے قوم نے استفادہ کیا۔

علاوہ ازیں اردو نثر میں جان ڈالنے والے محسن سرسید احمد خان اپنے مکتوب کی وجہ سے بھی کافی شہرت رکھتے ہیں۔انھوں نے اصلاحی مقصد سے کئی خطوط لکھے ہیں۔کچھ خطوط جوابی بھی ہیں جن کا تعلق مدرسۃ العلوم مسلمانان سے ہے۔غالب کی خطوط نگاری سے متصل زمانہ سرسید احمد کا ہے۔غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنایا ہے۔ان کا طرز تحریر گفتگو کا وہ انداز ہے جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب نگار اور مکتوب علیہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوں۔سرسید احمد خان کے سامنے غالب کے خطوط کا نمونہ موجود تھا۔انھوں نے مکتوب نگاری میں ایک نیا انداز اختیار کیا۔وہ ان کی شخصیت ہشت

پہل تھی۔ وہ ایک مصلح قوم، ایک مستند مورخ اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ لہٰذا ان کے مکاتیب علمی وادبی، اصلاحی اور مذہبی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ خواجہ احمد فاروقی بیان کرتے ہیں کہ

> '' آگرہ میں آدم نثر جدید بانیٔ مدرسۃ العلوم اور حامی ملک وملت کے چہرے کے تمام خط وخال دیکھنا ہے تو ہمیں سرسید کے خطوط کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہاں انھوں نے اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیا ہے۔''

ان کے خطوط راست گوئی اور سادگی کا بہترین نمونہ ہیں البتہ ان کی تحریر میں ادب کم اور وعظ گوئی کا پہلو زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ بعض معترضین کا خیال ہے کہ سرسید تعلیم نسواں کے خلاف تھے مگر ان کے خطوط پڑھ کر معاملہ بالکل برعکس دکھائی دیتا ہے۔ ان کے مکتوب میں تعلیم نسواں کی حمایت میں کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مسلم ممالک کی خواتین کی خواندگی پر بھی بات کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط کا جائزہ لیا جائے تو ان کے یہاں مجموعی طور پر تعلیمی واصلاحی جذبہ بدرجہ اتم نظر آتا ہے اور جرأت بیاں کے علاوہ حقیقت کو تسلیم کرنے کی قوت بھی برسرِ پیکار ہے۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

۱۔ سرسید احمد خان لندن میں انگریزی تہذیب سے کیوں متاثر ہوئے؟

۲۔ تہذیب الاخلاق پرچہ نکالنے کا پس منظر کیا تھا؟

۳۔ کتاب 'خطبات احمدیہ' کیوں لکھی گئی؟

۴۔ 'آثار الصنادید' میں کس چیز کا ذکر ملتا ہے؟

2.5 ڈپٹی نذیر احمد

2.5.1 ڈپٹی نذیر احمد : حیات

انیسویں صدی میں اردو ادب میں ناول کا آغاز انگریزی کی وساطت سے ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا اولین ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے اصلاحی قصوں کو ناول قرار دینا درست نہیں البتہ ڈپٹی نذیر احمد کے قصوں کو ایک نئے انداز میں رقم کرنے کا جو سلیقہ ہے اس کے رشتے ناول کی تکنیک سے ملائے جا سکتے ہیں۔ دراصل لفظ 'ناول' کے معنی نیا کے ہیں اور یہ انگریزی ادب سے مستعار ہے۔ اطالوی لفظ "Novella" کے معانی انوکھا، نرالا اور نئی چیز کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں ناول وہ قصہ یا کہانی ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہو یعنی انسانی زندگی کے

حالات اور واقعات کو انتہائی گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہوئے اسے ایک خاص انداز میں پلاٹ کے توسط سے کہانی کی شکل میں پیش کیا جائے۔ بقول سید وقار عظیم :

"ڈپٹی نذیر احمد کے قصوں میں وہ لوازم موجود ہیں جن کا مطالبہ جدید ناول سے کیا جاتا ہے۔"

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق 'نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی' کے مقدمے میں رقم طراز ہیں۔۔۔

''شمس العلماء ڈاکٹر مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ہماری قوم میں ایک ایسے فرد بے نظیر گزرے ہیں کہ وہ ہمیشہ یاد رہیں گے اور کم سے کم جب تک اردو زبان زندہ ہے ان کا نام بلا شبہ زندہ رہے گا۔ وہ محض اپنی محنت، استقلال اور قابلیت سے دنیا میں بڑھے اور ایک معمولی غریب شخص سے امیر اور ادنیٰ طالب علم سے اعلیٰ درجے کے فاضل ہو گئے۔''

جہاں تک مولانا کے سوانحی کوائف کا تعلق ہے مولانا اتر پردیش کے ضلع بجنور میں پیدا ہوئے، ان کے سنِ ولادت میں اختلاف موجود ہے۔ ۱۸۳۱ء یا ۱۸۳۶ء میں تحصیل نگینہ کے ایک گاؤں میں ان کی ولادت ہوئی۔ نذیر احمد کا تعلق شاہ عبدالعزیز اعظم پوری کے گھرانے سے تھا مگر ان کے والد مولوی سعادت علی صاحب نہایت غریب انسان تھے۔ تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ نہ کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا۔ بڑی کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزر رہی تھی۔

نذیر احمد نے فارسی زبان میں ابتدائی تعلیم اپنے والدین سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے انھیں کم سنی میں ہی دلی بھیج دیا گیا۔ جس مدرسے میں انھیں داخل کیا گیا تھا وہاں رہنے اور کھانے کا مفت انتظام تھا۔ وہیں اورنگ آبادی مسجد میں وہ مولوی عبدالخالق سے درس لینے لگے۔ اس وقت دلی میں مسلمانوں کے حالات نہایت ابتر تھے۔ مغل حکومت برائے نام قائم تھی۔ مدرسے کے طالب علموں کو محلے کے مختلف گھروں میں جا جا کر روٹیاں اور کھانے سمیٹنے پڑتے تھے۔ ہر گھر سے کچھ نہ کچھ روکھا سوکھا یا بچا ہوا کھانا مل جاتا تھا۔ اس تعلق سے وہ خود فرماتے ہیں۔۔۔۔

''پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبری لے کر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی، کسی نے قیمے کی لگدی ہی رکھ دی، کسی نے دو تین روٹیوں پر ٹرخا دیا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا تھا۔''

اس کے علاوہ مدرسے کے بچوں سے مولویوں کے گھروں کے کام بھی لیے جاتے تھے۔ نذیر احمد کو بھی مولویوں

کے گھروں میں جا کر خدمت بجا لانی پڑتی اور ساتھ ہی ساتھ مولوی کے تین چار شاگرد تھے جنھیں نذیر احمد کو پڑھانا ہوتا تھا۔ ذہنی قابلیت تو خدا داد تھی لہٰذا وہ رات دن پڑھائی میں مشغول رہتے۔ مولوی عبدالخالق کے بیٹے مولوی عبدالحامد کا مکان بھی وہیں پڑوس میں تھا، انھیں وہاں جانے کا بھی حکم دیا گیا تھا۔ نذیر احمد جب وہاں جاتے تو ان کی بیٹی (جو کہ آگے چل کر ان کی شریک حیات بنیں۔) ان سے مصالحے پسواتی۔ جہاں ان کا ہاتھ رکتا وہیں ان کے ہاتھ پر بٹہ مار دیتی۔ یہ اذیت وہ روز سہتے تھے۔ روزانہ سیر دو سیر مصالحے پسواتی اور روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ دیتی۔ پیستے پیستے ہاتھ میں گٹّے پر گئے تھے۔ کئی بار انھوں نے مولوی صاحب سے شکایت کی مگر مولوی صاحب نظر انداز کر دیتے۔ نذیر احمد جب پرانی باتوں کو یاد کرتے تو کہتے کہ جب بھی وہ باتیں ہم دونوں کو یاد آ جاتیں تو بے اختیار ہنسی آ جاتی۔ بچپن کی ظالم لڑکی جو نہایت شریر تھیں جوانی میں غریب ہو گئیں۔

بہر حال مدرسے کا دور بھی گزر گیا اور کالج کی تعلیم کے لیے دہلی کی گلیوں کے چکر کاٹتے رہے۔ ایک بار کشمیری دروازے سے گزر رہے تھے کہ دیکھا دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے۔ مفتی صدرالدین صاحب کالج کے لڑکوں کا امتحان لینے آئے ہوئے تھے۔ نذیر صاحب کا قد ان دنوں بہت چھوٹا تھا۔ چودہ پندرہ سال کے تھے مگر نو دس برس کے لگتے تھے۔ لوگوں کی ٹانگوں کے بیچ سے گھس کر کسی طرح اس کمرے میں پہنچے جہاں مفتی صدرالدین یکے بعد دیگرے لڑکوں کا امتحان لینے میں مصروف تھے۔ اتفاقاً ان کا پیر پھسل گیا اور وہ گر پڑے۔ پرنسپل صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ آگے بڑھ کر انھوں نے نذیر صاحب کو اٹھایا اور پوچھا کہ میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟ جب نذیر صاحب نے بتایا کہ وہ معلقات پڑھتے ہیں تو انھیں بڑا استعجاب ہوا۔ ان کا ہاتھ پکڑا اور سیدھا مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہا کہ ان کا امتحان لیں۔ اللہ نے علمی استعداد اور ذہنی قابلیت دے رکھی تھی اور رات دن پڑھائی کے شوق نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ مفتی صاحب کے تمام سوالوں کے اطمینان بخش جواب دیے۔ مفتی صاحب نے کتاب ان کے ہاتھ میں تھما دی اور کہا کہ آپ پڑھ سکتے ہو۔ انھوں نے پڑھا، پھر مفتی صاحب نے ایک شعر کے معنی ان سے پوچھے۔ نذیر احمد نے معنی و مفہوم ادا کرتے ہوئے نہایت سلیقے سے اس کی تفہیم و تشریح بھی فرمائی تو مفتی صاحب بہت چکرائے۔ ان سے پوچھا کہ انھیں کون پڑھاتا ہے؟ نذیر صاحب نے کہا کہ مسجد کے مولوی صاحب پڑھاتے ہیں۔ پوچھا کس مدرسے میں تو نذیر احمد صاحب نے بتایا کہ پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد والے مدرسے میں پڑھ رہا ہوں۔ مفتی صاحب ان سے کافی متاثر ہوئے اور ان سے پوچھا کہ یہاں پڑھوگے تو انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس طرح ان کا داخلہ کالج میں ہو گیا اور ان کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا گیا۔

مولوی نذیر احمد صاحب گھر میں ہوتے تھے تو نہ ٹوپی نہ پجامہ بس ایک چھوٹی سی تہمد باندھتے تھے بلکہ یہ تہمد ان

کی کمر سے لپٹی ہوتی تھی جو کہ گرہ کی جھنجھٹ سے آزاد ہوتی تھی اور تہمد کا بچا ہوا سرا جسم پر یہاں وہاں ڈال دیتے تھے۔ ان کے گھر پر آنے والوں میں اکثر ان کے شاگرد ہوا کرتے تھے۔ انھیں پڑھنے اور پڑھانے سے فرصت نہیں تھی مگر جب گھر سے باہر نکلتے تھے تو ان کا لباس قدرے مختلف ہوتا تھا۔ شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً ترکی ٹوپی چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے۔ گرمیوں میں نہایت صاف سفید اچکن اور سفید کرتہ پجامہ ہوتا اور جاڑوں میں کشمیری اچکن یا کشمیری کام کا جبہ پہنتے تھے اور پیروں میں اکثر سلیم شاہی جوتا استعمال کرتے تھے۔ اسٹیج پر لوگوں نے انھیں ایل ایل ڈی گاؤن پہنے بھی دیکھا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے انھیں ترقی کی منزلوں تک پہنچا دیا۔ تعلیم ختم ہوئی تو ان کی نوکری کا آغاز مدرس کی حیثیت سے ہوا۔ پنجاب سے ہوتے ہوئے الہ آباد پہنچے جہاں انھیں ڈپٹی مدرس کی ملازمت حاصل ہوئی۔ یہاں انھوں نے انگریزی کی تعلیم لی۔ ذہین تھے بہت جلد زبان پر عبور حاصل کر لیا۔ لہٰذا انگریز عہدے داروں نے انھیں تحصیل دار کے عہدے پر فائز کر دیا۔ بعد ازاں انھوں نے ڈپٹی کلکٹری کا امتحان امتیازی نمبروں سے کامیاب کیا اور ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے۔ سر سید احمد خان کی سفارش پر انھیں حیدر آباد میں ملازمت کا موقع ملا۔ یوں تو گورنمنٹ نے انھیں ان کی علمی خدمات پر اکثر و بیشتر انعامات سے نوازا لیکن ۱۸۹۸ء میں انھیں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور ۱۹۰۲ء میں انھیں اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

عمر کے آخری ایام میں جسمانی طاقت کم ہونا شروع ہوگئی۔ بینائی متاثر ہونے لگی۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔ اپنے گھر کے اوپری واحد کمرے میں پڑے رہتے لیکن مطالعے کا شغل عمر بھر قائم رہا اور تصنیف کا عمل بھی جاری رہا۔ خود کام نہیں کر پاتے تو دوسروں سے مدد لے لیا کرتے تھے۔ مقدمے کی پیشی کے لیے عدالت بھی جاتے۔ کئی میل پیدل چلتے۔ ذاتی سواری کبھی نہیں رکھی۔ کسی کی مدد سے کسی نہ کسی طرح عدالت پہنچ جاتے۔ وضعداری کے پابند تھے۔ زندگی کی آخری سانسوں تک اسے قائم رکھا۔ ۱۹۱۰ء میں ان پر فالج کا زبردست حملہ ہوا اور ۱۹۱۲ء میں وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ ناول کسے کہتے ہیں؟ مختصر تعارف دیجیے۔

۲۔ ڈپٹی نذیر احمد نے کہاں سے تعلیم حاصل کی؟

۳۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلی کالج تک کس طرح پہنچے؟

۴۔ نذیر احمد کو کن خطابات سے نوازا گیا؟

۵۔ کس یونیورسٹی نے نذیر احمد کو ایل ایل ڈی کی ڈگری تفویض کی؟

2.5.2 ڈپٹی نذیر احمد کی ادبی خدمات

اردو ادب میں جب بھی ناول نگاری کا تذکرہ کیا جائے گا ڈپٹی نذیر احمد کا نام ضرور لیا جائے گا بلکہ یوں کہیے کہ اردو ناول نگاری کا تذکرہ نذیر احمد کے نام کے بنا آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جن دنوں ہمارے یہاں قصوں اور کہانیوں میں دیو، جن، پری، بھوت جیسے مافوق الفطرت عناصر کا ذکر ہوا کرتا تھا، نذیر احمد نے انسانی زندگی اور ان کے حالات پر نظر رکھتے ہوئے اپنی کہانیاں تحریر کیں۔ اس طرح کہانیاں لکھنے کے سبب نذیر احمد کے قصوں کو ناول سے قریب محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یوں کہیے کہ اس کے رشتے ناول کی تکنیک سے ملائے جا سکتے ہیں۔ بقول سید وقار عظیم ۔۔۔''نذیر احمد کے قصوں میں وہ لوازم موجود ہیں جن کا مطالعہ جدید ناول سے کیا جاتا ہے۔''

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ناولوں کا قصر نذیر احمد کے قصوں کی بنیاد پر آگے چل کر بلند ہوا۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں اسلامی معاشرت اور مسلمانوں کی تہذیب اور رہن سہن کی بے لاگ تصویریں کھینچی ہیں جنھیں پڑھ کر آنکھوں کے سامنے سارا نقشہ پھر جاتا ہے۔ ان کی تحریر بے ساختہ اور بے تکلف ہے اور ان کے یہاں تشبیہ واستعارات کا استعمال بہت کم ہے۔ کبھی کبھی بے موقع محاورات کا ذکر کر دیتے ہیں اور انگریزی کے الفاظ بھی ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ شوخی وظرافت کی فضا بھی ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ روانی اور تسلسل ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔

''مراۃ العروس'' ان کا پہلا ناول ہے جو ۱۸۶۹ء کو شائع ہوا۔ یہ ایک اصلاحی ناول ہے۔ دراصل یہ کتاب سب سے پہلے انھوں نے اپنی بیٹی کے لیے لکھی تھی۔ ۱۸۶۹ء میں جب ان کی اولاد اس قابل ہوئی کہ انھیں تعلیم کے میدان میں داخل کرنے کا وقت آیا اور نذیر صاحب نے نصاب کی کتب کا معائنہ ومطالعہ کیا تو انھیں اس وقت کی رائج کتب سے اطمینان نہیں ہوا۔ لہٰذا اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے انھوں نے خود کتابیں تیار کیں۔ بیٹے کے لیے ''چند پند'' اور بیٹی کے لیے ''مراۃ العروس'' تحریر کی۔ بچوں کو ان کی ورق گردانی میں لطف آنے لگا۔ ایک دن بیٹا بشیر باغ کی سیر کو گیا تو ساتھ میں اپنے والد کی کتاب بھی لے گیا۔ اسی باغ میں محکمۂ تعلیم کا ایک ڈائرکٹر جو انگریز تھا، باغ کی سیر کر رہا تھا۔ نذیر احمد کے بیٹے نے انھیں پہچان کر سلام کیا۔ انگریز نے سلام کا جواب دیا اور دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب ہے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہ کتاب ان کے والد کی تحریر کردہ ہے۔ ڈائرکٹر کی نظر سے یہ کتاب گزری نہیں تھی۔ تعجب سے پوچھا تو پتہ چلا کہ نذیر احمد نے بیٹے کے لیے کتاب 'چند پند' اور بیٹی کے لیے 'مراۃ العروس' لکھی ہے۔ انھوں نے مراۃ

العروس بھی منگوائی اور بیٹے کو کہا کہ شام تک یہ کتابیں آپ کے گھر پہنچ جائیں گی۔ جب نذیر احمد کو تمام باتوں کا علم ہوا تو انھیں استعجاب ہوا کہ ڈائرکٹر صاحب کو بچوں کی کتب کی ضرورت کیوں آن پڑی۔ کچھ ہفتے گزرے تھے کہ انھیں اس افسر کا خط ملا جس میں تحریر تھا کہ صوبائی حکومت نے اس کتاب پر مصنف کو ایک ہزار کی رقم اور ایک گھڑی بہ طور تحفہ دینے کا اعلان کیا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ مراۃ العروس کی شہرت کی دھوم مچ گئی۔ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ کئی زبانوں میں آج تک اس کتاب کا ترجمہ ہوا ہے۔ اس وقت یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی بیٹیوں کو شادی کے جہیز میں یہ کتاب دیا کرتے۔

اس کے علاوہ ان کی کئی تصانیف ہیں جن میں ’توبۃ النصوح، ابن الوقت، رویائے صادقہ، فسانۂ مبتلا، بنات النعش‘‘ شامل ہیں جو کافی معروف کتابیں ہیں۔ مراۃ العروس دو بہنوں کی کہانی ہے جن میں ایک بڑی بہن جو کہ پھوہڑ اور بدسلیقہ ہے اور چھوٹی بہن، اس کے برعکس۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی بہن کی اپنی سسرال میں نبھ نہیں سکی اور کسی سے بن نہ سکی اور چھوٹی بہن نے اپنی خوبیوں سے ہر ایک کا دل جیت لیا۔

ان کی ایک اور کتاب ’بنات النعش‘ پر بھی حکومت نے انھیں 500 روپیے کی رقم اور کئی انعامات واکرامات سے نوازا۔ ان کی ایک اور معرکۃ الآراء کتاب ’توبۃ النصوح‘ نے قارئین کے دلوں کو موہ لیا۔ ناقدین نے ان کی اس کتاب کو شاہ کار کا درجہ دیا ہے۔ یہ مولوی صاحب کا تیسرا ناول تھا جو اولاد کی تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کے حوالے سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ محض تعلیم ہی کافی نہیں ہے۔ اولاد کی پرورش میں دین داری اور نیکی کی طرف مائل ہونے کی تربیت بھی دی جانی چاہیے اور نصوح نے اپنی اولاد کی پرورش اس طرح نہ کی تھی۔ اس لیے جب وہ ہیضے کی وبا میں مبتلا ہوتا ہے تو خواب اور غنودگی کی حالت میں وہ خود کو حشر کے میدان میں تہی دامن اور تہی دست پاتا ہے مگر خواب سے بیداری کے بعد وہ اس کا اثر محسوس کرتا ہے جب اس کی طبیعت بحال ہوجاتی ہے تب وہ اپنی ساری توجہ اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت پر مبذول کر دیتا ہے اور خاندان کی اصلاح کی جانب متوجہ ہوجاتا ہے۔

اگرچہ دیکھا جائے تو ’بنات النعش‘ کا موضوع بھی امور خانہ داری کی تربیت سے تعلق رکھتا ہے نیز اخلاقی تعلیم کی جانب توجہ دلانے کا سبب بنتا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب ’فسانۂ مبتلا‘ سماج کی اس خرابی کی جانب اشارہ ہے جہاں ایک سے زائد شادیوں کا رواج ہے اور ’ابن الوقت‘ کی کہانی دوسروں کی اندھی تقلید کو اپنانے کے برے نتائج پر منحصر ہے۔ اس کہانی کے توسط سے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمیں اپنی تہذیب سے بہرہ ور ہونا چاہیے نہ کہ دوسروں کی تقلید کر کے اپنی تہذیب کو رسوا کیا جائے۔ کیونکہ اس طرح کے لوگ آخر میں اپنے عمل پر شرمندہ ہوتے ہیں اور پچھتانے کے سوا ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا ہے۔

’رویائے صادقہ‘ ان کا آخری ناول ہے جس میں مذہبی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور نئی نسل کے لیے پیغام موجود

ہے کہ چاہے وہ کتنی ہی اعلیٰ تعلیم کیوں نہ حاصل کریں انھیں اپنے مذہب سے دور نہیں ہونا چاہیے۔غرض یہ کہ ان کی ہر کتاب کسی نہ کسی اصلاحی مقصد کے تحت تحریر عمل میں لائی گئی ہے۔ان کی تصنیفات میں 'ایامی، منتخب الحکایات، امہات الامہ' کے علاوہ کئی اصلاحی، دینی و مذہبی کتب شامل ہیں۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

۱۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیفات کے نام بتائیے۔

۲۔ مولوی نذیر احمد کا پہلا ناول کس مقصد سے لکھا گیا ہے؟

۳۔ توبۃ النصوح کا مرکزی خیال کیا ہے؟

۴۔ بنات النعش ناول کا مقصد کیا ہے؟

2.6 خلاصہ

میر امن دہلوی کا تعلق دہلی سے تھا۔دہلی کی تاراجی اور تباہی کے بعد وہ عظیم آباد سے ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ بالآخر کلکتہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہاں وہ فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کرنے لگے تھے۔دورانِ ملازمت انھوں نے دو کتابیں 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' تصنیف کیں۔'باغ و بہار' میر امن کا بہترین کارنامہ ہے جسے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ یہ ان کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے بلکہ فارسی کی کتاب 'قصہ چہار درویش' کا اردو ترجمہ ہے۔دوسری کتاب 'گنج خوبی' ہے جسے شہرت نصیب نہ ہوسکی۔البتہ ان کی یہ تصنیفات اردو ترجمہ نگاری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔جب بھی فورٹ ولیم کالج کا ذکر کیا جائے گا میر امن کا نام بھی اس میں شامل ہوگا۔

سرسید احمد خان ایک مصلح قوم، ایک سچے صحافی، ایک بہترین انشائیہ نگار اور مکتوب نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔وہ حامئ قوم اور خادم قوم ہیں جن کی کاوشات آج ہمیں باور کراتی ہیں کہ مخالفین کی لاکھ سازشوں کے باوجود انسان اگر ہمت وعزم کو بلند کرے تو وہ اپنی منزل ضرور پالیتا ہے۔سرسید احمد خان ہمارے لیے ایک رول ماڈل ہیں۔ان کا بڑا کارنامہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے روپ میں موجود ہے۔مسلمانوں کی تعلیم کے جذبے کو فروغ دینے میں ان کا کردار کافی اہم ہے۔مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کے لیے انھوں نے تعلیم کو عام کیا، مدرسے قائم کیے، دواخانے بنائے اور سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا۔جس کا مقصد مسلمانوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذوق کو فروغ دینا تھا۔ان کے خطوط بھی ادبی، علمی، مذہبی اور اصلاحی نقطۂ نظر کی حمایت کرتے ہیں۔ان کی تصانیف کی کافی لمبی فہرست ہے۔انھوں نے بذریعہ

تحریر وقلم ہندوستانی مسلمانوں کو بیدار کرنے ،ان میں عمل کی قوت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔قوم کو ترقی کی راہوں پر گامزن کرنا ان کا نصب العین تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی زندگی دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔محنت لگن اور ذہانت سے انسان اپنا مقصد پالیتا ہے۔ان کے ناولوں کا مقصد اصلاحی جذبہ ہے اور خاص طور پر اولاد کی تربیت اور پرورش میں اخلاقی ،دینی اور مذہبی امور کا خاص ذکر ہے جس کے سبب معاشرے میں نیک اور صالح افراد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔جو سماج کو برائیوں سے پاک کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔لہٰذا ان کے ہر ناول میں کوئی نہ کوئی سماجی ،اخلاقی ،دینی اور مذہبی مقاصد موجود ہیں۔چند ناقدین ڈپٹی نذیر احمد کو ناول نگار تسلیم نہیں کرتے اور ان کی ناولوں میں خامیاں تلاش کرتے ہیں۔ان خامیوں کے باوجود ان کے ناول اردو فکشن کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ان کی انہی کتابوں کے توسط سے اردو ناولوں کے عروج کو پھلنے پھولنے میں مدد ملی ہے۔

2.7 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ میر امن دہلوی کی ترجمہ نگاری کی خوبیوں پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ میر امن دہلوی کی تصنیفات کا مختصر جائزہ لیجیے۔

۳۔ سرسید احمد خان کی حیات کے چند گوشوں کو اجاگر کیجیے۔

۴۔ سرسید احمد خان کی انشا پردازی پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔

۵۔ مکتوب نگاری کے حوالے سے سرسید احمد خان کے اسلوب کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

۶۔ ڈپٹی نذیر احمد کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالیے۔

۷۔ ڈپٹی نذیر احمد کا حلیہ بیان کیجیے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ میر امن دہلوی کے سوانحی کوائف لکھیے۔

۲۔ 'باغ و بہار' کے پیش نظر میر امن دہلوی کی اسلوب نگاری پر اپنے خیالات رقم کیجیے۔

۳۔ سرسید احمد خان کے سوانحی کوائف لکھیے۔

۴۔ سرسید احمد خان کی نگارشات کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

۵۔ سرسید احمد خان کے مکتوبات میں اصلاحی نقطۂ نظر کی نشان دہی کیجیے۔

۶۔ ڈپٹی نذیر احمد کی مختصر سوانح حیات رقم کیجیے۔

۷۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

۸۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں میں اصلاحی نکتہ نظر پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔

2.8 فرہنگ

تشنگی	پیاس، کمی	تاراج	تباہ ، برباد
رسائی	پہنچ	طبع زاد	خود کا ایجاد کردہ
موروثی	وراثت سے، نسل در نسل	مقیم	ٹھہرنا، قیام کرنا
عذر	بہانہ	سلاست	روانی
اتالیق	استاد، تربیت دینے والا	مرصع	سجا ہوا، نگینہ جڑنے والا
اذیت	تکلیف	اصلاح	ترمیم، درست کرنا
شوخی	ظرافت	ابن الوقت	وقت کا بیٹا (وقت کے ساتھ چلنے والا)
بے محل	بے موقع، بے وقت	معاشرت	تہذیب، رہن سہن
رعشہ	کمزوری، تھرتھراہٹ	رویا	خواب
عیب	برائی، خامی	دریغ	تامل، کثرت سے
جانکاہی	دل و جان سے، جاں گداز، روح فرسا	ذوق	شوق
تعصب	خود غرضی	مدلل	دلیل کے ساتھ
سنگ بنیاد	اساسی بنانا، بنیاد کا پتھر رکھنا	مقالات	مضامین
تصنع	بناوٹ	دور اندیش	عاقبت اندیش، مآل اندیش

2.9 معاون کتابیں

باغ و بہار : میر امن دہلوی

گنج خوبی : میر امن دہلوی

نوطرزمرصع : میرمحمدعطاخان تحسین

میرامن دہلوی،حیات وتالیف : ڈاکٹرنفیس جہاں بیگم

خطباتِ احمدیہ

مقالات سرسید

سیرت فریدیہ

تہذیب الاخلاق

سرسیدکی نثری خدمات : مشتاق احمد (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،2005)

نذیراحمدکی کہانی۔کچھ میری کچھ ان کی زبانی : مرزافرحت اللہ بیگ

کلیاتِ ڈپٹی نذیراحمد : مرتبہ : راناخضرسلطان

کلیاتِ ڈپٹی نذیراحمد : نذیراحمد (کتابی دنیا،دہلی)

☆☆☆

اکائی : 3۔ مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، کرشن چندر

ساخت:

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 مولوی عبدالحق

3.3.1 مولوی عبدالحق کے معاصر خاکہ نگار

3.3.2 مولوی عبدالحق کے سوانحی کوائف اور ادبی خدمات

3.3.3 مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

3.4 رشید احمد صدیقی

3.4.1 اردو میں انشائیہ نگاری اور رشید احمد صدیقی کا عہد

3.4.2 رشید احمد صدیقی کے سوانحی کوائف

3.4.3 رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری

3.5 کرشن چندر

3.5.1 کرشن چندر کے معاصر افسانہ نگار

3.5.2 کرشن چندر کے سوانحی کوائف اور ادبی خدمات

3.5.3 کرشن چندر کی افسانہ نگاری

3.6 خلاصہ

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.8 فرہنگ

3.9 معاون کتابیں

3.1 اغراض ومقاصد

نصاب میں شامل خاکے، انشائیے اورافسانے کی تدریس کے ذریعے درج ذیل اہداف حاصل کرانا اس اکائی کے مقاصد ہیں :

۱۔ طلبہ کواردونثر کی اہم صنف ’خاکہ‘ سے روشناس کرانا۔

۲۔ طلبہ کواردونثر کی اہم اصناف ’انشائیہ‘ اور ’افسانہ‘ کے مبادیات اورعناصرِ ترکیبی سے روشناس کرانا۔

۲۔ مولوی عبدالحق کے ہم عصر خاکہ نگاروں رشیداحمد صدیقی کے ہم عصرانشائیہ نگاروں اورکرشن چندر کے ہم عصر افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف پیش کرنا۔

۴۔ مولوی صاحب کے سوانحی کوائف اوراردوزبان وادب کے فروغ میں اُن کی بے مثال خدمات سے طلبہ کوواقف کرانا۔

۵۔ رشیداحمد صدیقی کے سوانحی کوائف اوراردوانشائیے کی ترقی میں اُن کی خدمات سے طلبہ کوواقف کرانا۔

۶۔ کرشن چندر کے سوانحی کوائف اوراردوافسانے کی ترقی میں اُن کی بے مثال خدمات سے طلبہ کوواقف کرانا۔

۷۔ مولوی صاحب کوبطورایک اہم خاکہ نگار متعارف کرانا۔

۸۔ رشیداحمد صدیقی کوبطورایک اہم انشائیہ نگار متعارف کرانا۔

۹۔ کرشن چندرکوبطورایک اہم افسانہ نگار متعارف کرانا۔

3.2 تمہید

اردواسالیبِ نثر میں ’خاکہ‘ ایک دل چسپ اورمقبولِ عام صنف ہے۔اس میں ہمیں ’موضوع‘ یعنی اس شخصیت سے واقف ہونے کا موقع بھی ملتا ہے جس کی قلمی تصویر پیش کی گئی ہے اورخاکہ نگار کے مزاج، اس کے نقطۂ نظر اوراس کے پسندیدہ سماجی رویوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔خاکہ نگاری کا فن بڑا ریاض چاہتا ہے۔ اس میں مصنف اُن اشخاص کی تصویریں الفاظ میں کھینچتا ہے جنھیں اس نے دیکھا بھالا اور جانا پہچانا ہے۔ یہ مرقعے اس طرح کھینچے جاتے ہیں کہ موضوع کے ظاہروباطن دونوں پرنگاہ پڑتی ہے۔قارئین کو یہ تصویریں جانی پہچانی معلوم ہوتی ہیں۔سیرت نگاری کا کمال یہ ہے کہ مصنف اپنے موضوع کی خوبیوں اورکم زوریوں کو پورے خلوص اورہم دردی کے ساتھ پیش کرے۔شخصیت سے جذباتی لگاو، عقیدت یا کبھی کبھی حد سے بڑھی ہوئی نفرت، خاکے میں عدم توازن کی کیفیت پیدا کرسکتی ہے اورخاکہ نگار کا یک طرفہ جھکاو خاکے کے وقار کو مجروح کرسکتا ہے۔عام طور پر خاکوں میں تاریخ سے زیادہ تاثر کو پیش کیا جاتا ہے اوراس میں سوانحی تفصیلات اورکارناموں کے ذکر سے زیادہ شخصیت کے مزاج اورنفسیاتی کیفیات کو سمجھنا اور بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

تاہم خاکہ کوئی افسانوی صنف نہیں ہے کہ حقائق سے صَرفِ نظر کرکے صِرف تخیّل کی اڑان بھری جائے اور احوالِ واقعی سے کوئی غرض نہ رکھی جائے۔ خاکے کے اسی ملے جلے انداز نے اسے زیادہ دل چسپ اور متنوع بنایا ہے۔ ایک ہی موضوع کو مختلف خاکہ نگار اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی اور اسلوبِ نگارش سے بالکل مختلف شخصیت بنادیتے ہیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ شاہد احمد دہلوی نے بھی لکھا ہے اور عصمت چغتائی نے بھی۔ دونوں کے ذاتی تجربات وتاثرات بھی مختلف ہیں اور پیش کش کا انداز بھی جدا۔ دونوں خاکے قارئین کے ذہن پر مختلف اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اسی طرح میرا جی کو بھی ان کے عہد کے اہم خاکہ نگاروں نے موضوع بنایا ہے۔ ان میں شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے تجرابات واحساسات قلم بند کیے ہیں اور ہر خاکہ لطف دیتا ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز معروف ومنفرد مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے 'ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ اُن کی کچھ میری زبانی' سے ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے ایک اور خاکہ 'ایک وصیت کی تعمیل' بھی لکھا تھا۔ ان دونوں خاکوں کی مقبولیت کو دیکھ کر اکثر اہلِ قلم نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ مولوی عبدالحق کے سنجیدہ وبردبار قلم نے بھی اس صنف کو مفیدِ مطلب محسوس کیا۔ انھوں نے اپنے معاصرین کی قلمی تصویریں پیش کی ہیں۔ مولوی صاحب کے لکھے ہوئے خاکوں کا مجموعہ 'چند ہم عصر' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

اردو کے جدید اسالیبِ نثر میں 'انشائیہ' ایک دل چسپ اور مقبولِ عام صنف ہے۔ انگریزی میں اسے Light Essay کہتے ہیں۔ اس میں کسی عنوان کے تحت مصنف غیر رسمی انداز میں اپنے مشاہدات وتجربات بیان کرتا ہے۔ مصنف کا مقصد اس عنوان کی رسمی تفصیلات پیش کرنا یا اس کے مختلف پہلوؤں کی منطقی اور سائنسی تشریحات وتوضیحات پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ اس عنوان کو اپنے خیالات کی ترنگ، جدّتِ طبع اور مزاج کی شوخی کو اجاگر کرنے کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ اسی طریقۂ کار کی بنا پر انشائیہ، کسی رسمی مضمون سے الگ اپنی شناخت کرواتا ہے۔ مثال کے طور پر 'الیکشن' کا عنوان لیجیے۔ عام رسمی مضمون میں 'الیکشن' کسے کہتے ہیں، یہ کیوں کرائے جاتے ہیں، ان کا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے، ان میں امیدواری کی شرائط کیا ہیں، اور کون اپنا حقِ رائے دہی استعمال کرے گا، جیسے سوالوں کے جوابات ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ مصنف الیکشن کی تاریخ اور دنیا میں اس کے تدریجی ارتقا پر بھی روشنی ڈالے اور اس کے فائدے اور نقصانات سے بحث بھی کرے۔ لیکن جب اسی عنوان کے تحت انشائیہ لکھا جائے گا تو مصنف کو اس طرح کی رسمی باتوں سے کوئی غرض نہ ہوگی۔ وہ تو الیکشن سے متعلق اپنے نجی تجربات واحساسات میں قارئین کو شریک کرے گا۔ وہ اپنے قارئین سے گفتگو بلکہ سرگوشی کرتا ہو معلوم ہوگا۔ کبھی ایسا بھی محسوس ہوگا کہ الیکشن تو محض ایک بہانہ ہے، وہ متعدد تجربات میں اپنے قارئین کو شریک کررہا ہے، بات میں بات نکل رہی ہے اور کائنات کے دوسرے موضوعات بھی زیرِ بحث آرہے ہیں۔ کبھی مصنف اپنے موضوع سے بہت دور

نکل کر خلا میں ایک چکر لگاتا ہوا پھر اصل نکتے کی طرف پلٹ آئے گا اور ہمیں یاد دلائے گا کہ بات 'الیکشن' کی چل رہی تھی۔

'انشائیہ' کی صنفی شناخت قائم کرنے اور اُسے دوسرے اسالیبِ نثر سے ممتاز کرنے کے لیے ناقدینِ فن نے خاصی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں، اور اس کے عناصرِ ترکیبی کی فہرست تیار کی ہے۔ زیادہ تر اس بات پر متفق ہیں کہ انشائیہ کا بنیادی مقصد معلومات بہم پہنچانا نہیں بلکہ سرور و انبساط اور کیف کے لمحے فراہم کرنا ہے۔ انشائیہ کا سفر خود آگہی سے شروع ہوتا۔ مصنف اس کے وسیلے سے انکشافِ ذات کے مراحل طے کرتا ہے۔ اس میں علم و حکمت، دانش وری اور بصیرت افروزی کی بے پناہ گنجائشیں موجود ہیں۔ اس کا مطالعہ قاری کے شعور میں بالیدگی پیدا کرسکتا ہے، اسے نئے زاویۂ نگاہ عطا کرسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ مصنف کے تجربات کو محض اتفاقاتِ زمانہ سے تعبیر کرے۔ انشائیہ کی ایک خوبی کسی عنوان سے متعلق 'عدمِ تکمیل' کا احساس بھی ہے۔ یعنی پڑھنے والے کو تشنگی کا احساس ہو۔ اسے ایسا لگے کہ اس گفتگو کو مزید کچھ دیر جاری رکھا جاسکتا تھا۔ چند پہلو تشنہ رہ گئے ہیں جنھیں بیان کیا جاسکتا تھا۔ لیکن انشائیہ نگار کو اس سے غرض نہیں کہ موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہوا ہے یا نہیں اور بحث اپنے منطقی انجام کو پہنچی ہے یا ابھی کچھ باتیں وضاحت طلب ہیں۔

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے اپنی کتاب 'ملا وجہی اور انشائیہ' میں انشائیہ کی حتمی تعریف متعین کرنے اور اس کے خدوخال واضح کرنے کے لیے تحقیق و تلاش سے کام لیا ہے۔ انھوں نے 'انشائیہ' کی مندرجہ ذیل سولہ خصوصیات گنوائی ہیں:

۱۔ بے تکلفی و سادگی ۲۔ اختصار و جامعیت ۳۔ انکشافِ ذات
۴۔ عصری آگہی ۶۔ تحلیلِ نفس ۶۔ منتشر خیالی و بے ربطی
۷۔ موضوع کا تنوّع ۸۔ آزادیِ تحریر ۹۔ خود کلامی
۱۰۔ وسعتِ فکر و نظر ۱۱۔ نیا تناظر ۱۲۔ لطف اندوزی و مسرت آفرینی ۱۳۔ داخلیت اور غنائیت
۱۴۔ تازگی اور شگفتگی ۱۵۔ رنگینی و ظرافت ۱۶۔ نکتہ آفرینی

یہ ضروری نہیں کے ہر فن پارے کو انھیں عناصر کی روشنی میں پرکھا جائے اور اس پر 'انشائیہ' ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگایا جائے۔ محترمہ کی کاوش یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ 'انشائیہ' کسی عام، بامقصد، باضابطہ مضمون سے الگ اپنی صنفی شناخت رکھتا ہے اور دوسری تخلیقی اصناف کی طرح اِس کا فن کار بھی مخصوص تخلیقی مزاج اور جوہر رکھتا ہے۔ انشائیہ نگاری کو بعض ناقدین نثر میں غزل کہنے کا فن بھی سمجھتے ہیں۔ جس طرح مرصّع غزل کہنا ہر شاعر کے بس میں نہیں بالکل اسی طرح عمدہ انشائیہ تخلیق کرنا بھی ہر نثر نگار کے لیے ممکن نہیں۔

اردو کے جدید اسالیبِ نثر میں 'افسانہ' ایک دل چسپ، سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مقبولِ عام صنف ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے اردو افسانے کا دور شروع ہوتا ہے اور آج اکیسویں صدی کی دو دہائی گزرنے کے بعد

بھی 'افسانہ' نہ صرف اردو کی اہم ترین صنفِ نثر کی مسند پر فائز ہے بلکہ مختلف ادبی تحریکات، رجحانات اور تجربات سے گزرتا ہوا، مسائلِ زندگی کی عکاسی کرنے اور اپنے عہد کی سماجی و سیاسی ترجمانی کرنے میں، یہ مضبوط سے مظبوط تر اور مفید سے مفید تر ہوتا جارہا ہے۔ اس وسیع ترین کائنات کا ہر موضوع اِس کی گرفت میں ہے۔ اس میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو فن کاری کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا ہے۔ فرد کی ذات کا المیہ ہو یا اس کے نفسیاتی مسائل کا تجزیہ، سماج میں موجود طبقاتی کشمکش اور اس سے ابھر آنے والے مسائل ہوں یا مختلف انقلابی و سیاسی تحریکیں، نظریاتی جنگیں ہوں یا مذہبی، لسانی اور علاقائی تعصّبات، سائنسی و تکنیکی پیش رفت اور ان سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں ہوں یا ارضی و سماوی آفات، مادی علوم و فنون کی ترقی ہو یا روحانی سفر کی حیرت انگیزیاں، بادشاہی زندگی کا جاہ وجلال ہو یا فقیر کے کُٹیا کی کہانی، اردو افسانے نے ہر موضوع کو کامیابی سے برتا ہے۔ اس عرصے میں افسانہ نگاروں نے اسلوب اور تکنیک کے بیش بہا تجربات کیے ہیں اور 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' دونوں کے قارئین نے اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے 'افسانے' ہی کو موضوع ترین صنف سمجھا ہے۔ اسی لیے رومانیت اور تخیل پسندی کے بہترین نمونے اور سفاک حقیقت نگاری کی بہترین مثالیں، اردو افسانوں کے خزانے میں موجود ہیں۔

'افسانہ' ایک مخصوص صنفِ ادب ہے جو اپنی ماہیت، نوعیت اور مقصد کے لحاظ سے دیگر اسالیبِ نثر سے علاحدہ شناخت رکھتی ہے۔ اس میں کسی واقعے، کردار، جذبے، احساس، تاثر، اصلاحی مقصد یا روحانی کیفیت کو اس طرح کہانی کے روپ میں سمیٹا جاتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد وہ کوئی مثبت یا منفی رائے ضرور قائم کرتا ہے۔ انسانی زندگی، اس کے رشتوں اور رویوں میں بوالعجبی ہے۔ انسان ہمیشہ متوقع اور یقینی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوتا۔ اتفاقات، حادثات اور غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا کرنا بھی اس کا مقدر ہے۔ 'افسانہ' اِن بے شمار کہانیوں میں سے کسی ایک کو فن کاری کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے اِس شرط کے ساتھ کہ وحدتِ تاثر قائم رہے اور قاری گراں بار ہوئے بغیر اسے ایک نشست میں مکمل کرسکے۔ فنی اعتبار سے 'افسانہ'، ڈرامے، خاکے، انشایئے، ناول اور ناولٹ سے الگ ہوتا ہے گو کہ ان میں سے ہر صنف، زندگی سے بھرپور کہانیاں اور جیتے جاگتے کردار پیش کرتی ہے لیکن ہر صنف اپنی پیش کش اور مقاصد کے لحاظ سے دوسری صنف سے ممتاز اور منفرد ہوتی ہے۔ موضوع، سرخی، پلاٹ، فضا یا ماحول، کردار اور مکالمے وغیرہ دراصل مشترک عناصرِ ترکیبی ہیں جو ہر صنف کے فنی تقاضوں کے تحت جلوہ گر ہوتے ہیں، مصنف کی تخلیقی صلاحیتیں اور اس کا اسلوبِ تحریر انھیں فن پاروں میں تبدیل کرتا ہے۔ ہر زمانے کا ادب اپنے عہد کی زندگی کو پیش کرتا ہے، وہ اپنے عہد کی تبدیلیوں کو انگیز بھی کرتا ہے اور اس پر کسی نہ کسی صورت اثر انداز ہونے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اردو افسانے کا تاریخی و تدریجی مطالعہ کرکے ہم برّصغیر کی سماجی، سیاسی، لسانی، تہذیبی و ثقافتی اور دیگر مادی تبدیلیوں کا گراف تیار کرسکتے ہیں۔

اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز منشی پریم چند کے افسانے 'دنیا کا سب سے انمول رتن' سے ہوتا ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۰۷ء میں کان پور سے نکلنے والے رسالے 'زمانہ' میں شائع ہوا تھا۔ ان سے پہلے سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبان کے بعض افسانوں کا ترجمہ پیش کیا تھا۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ مصورِ غم اور معروف ناول نگار علامہ راشد الخیری کے افسانے 'نصیر اور خدیجہ' کو تاریخی لحاظ سے اولیت حاصل ہے۔ اُن کا یہ افسانہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا ہے اس لیے موصوف ہی اردو کے پہلے افسانہ نگار کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک منشی پریم چند سے پہلے کئی ادیبوں کی ایسی تخلیقات شائع ہوئی ہیں جنھیں 'افسانہ' قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ منشی پریم چند ابتدائی دور کے ہمارے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے تین سو سے زیادہ افسانوں میں دیہاتی زندگی اور اس سے جڑے مسائل کو پورے خلوص اور فن کارانہ چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ اُن کا افسانہ 'کفن' سماجی حقیقت نگاری اور انسانی رشتوں اور رویوں کی سفاک کہانی سناتا ہے۔ پریم چند کی زندگی ہی میں ہندستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنو میں منعقد ہوئی تھی جس کی صدارت انھوں نے کی تھی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو زندگی سے قریب لانے کے ساتھ اُسے سیاسی انقلاب کے حصول کا آلۂ کار بنایا۔ ترقی پسند تحریک کی جڑیں اشتراکیت میں پیوست تھیں اور اس سے وابستہ تمام مصنفین اور شعرا، سماجی نابرابری کو ختم کرنے، سرمایہ دارانہ نظام سے چھٹکارا پانے، مزدوروں اور محنت کشوں کو اُن کا حق دلانے اور عوامی انقلاب برپا کرنے کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔ کرشن چندر بھی ترقی پسند ادیب تھے اور ادب میں اشتراکی نظریے کی تبلیغ و اشاعت اُن کا نصب العین تھا۔

3.3 مولوی عبدالحق

3.3.1 مولوی عبدالحق کے معاصر خاکہ نگار

مرزا فرحت اللہ بیگ اردو کے اوّلین خاکہ نگار ہیں۔ انھوں نے 'ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی۔۔ کچھ اُن کی کچھ میری زبانی' لکھ کر اردو میں اس صنف کی بنیاد رکھی۔ اُن کا دوسرا خاکہ 'ایک وصیت کی تعمیل' تھا جو وحید الدین سلیم پانی پتی کی قلمی تصویر پیش کرتا ہے۔ دراصل ڈپٹی نذیر احمد کے خاکے کی مقبولیت کے بعد وحید الدین سلیم نے مرزا فرحت اللہ بیگ کو وصیت کی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد مرزا صاحب اُن کا بھی ایسا ہی ایک خاکہ لکھیں گے۔ دونوں خاکے مرزا صاحب کے مزاحیہ اسلوب کی بنا پر نہ صرف دل چسپی سے پڑھے گئے بلکہ دوسرے قلم کاروں کو ان سے زبردست تحریک ملی اور اردو میں خاکہ نگاری کا رجحان چل نکلا۔

مولوی عبدالحق نے 'چند ہم عصر' لکھ کر اس روایت کو مستحکم کیا۔ مولوی صاحب کے اسلوب میں سنجیدگی تھی مگر تحریر کی سادگی اور خلوص نے ان کے خاکوں کو شہرت عطا کی۔ انھوں نے حالیؔ، محسن الملک، وحید الدین سلیمؔ، مولوی چراغ علی اور سیّد محمود جیسی قد آور شخصیت کے ساتھ نور خان سپاہی اور نام دیو مالی کو بھی موضوعِ قلم بنایا۔

چراغ حسن کاشمیری کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ 'مردم دیدہ' ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے لطیف اور مزاحیہ اسلوب میں اُن مشاہیر کی تصویر کشی کی جن سے اُن کے ذاتی مراسم تھے۔ اسی طرح خواجہ عبدالمجید نے 'یادِ رفتگان' کے نام سے ۱۹۴۱ء میں اپنے خاکوں کا مجموعہ شائع کیا جس میں دوست احباب کی زندگی کے چشم دید واقعات قلم بند کیے گئے تھے۔ عبدالرزاق کانپوری نے 'یادِ ایّام' میں اپنے عہد کے اہم سیاسی رہنماؤں اور ادبی شخصیتوں کے نقوش ابھارے۔

خاکہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم نام معروف مزاح نگار شوکت تھانوی کا ہے جنھوں نے 'قاعدہ بے قاعدہ' اور 'شیش محل' میں اپنے دور کی علمی و ادبی شخصیتوں کو پیش کیا۔ ان کے بعض خاکے بہت مختصر ہیں لیکن انھوں اپنے موضوعات کی ان خوبیوں کو اجاگر کرنے میں کام یابی حاصل کی ہے جن سے ان کی شناخت قائم ہوتی ہے۔

رئیس احمد جعفری نے 'دید و شنید' لکھ کر خاکہ نگاری میں ایک نئے طرز کو جگہ دی۔ ان کے خاکوں میں شخصیتیں پوری طرح نہیں ابھرتیں لیکن اکثر ایسے واقعات قلم بند کیے ہیں کہ قاری پر موضوع کا مثبت یا منفی تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ رشید احمد صیقی نے صحیح معنوں میں اس فن کی آب یاری کی۔ مشاہیر کے علاوہ انھوں نے عام انسانوں کے خاکے بھی لکھے۔ رشید صاحب کے پیشِ نظر بے ریا زندگی، بے لوث محبت اور محنت و انکسار جیسی خصوصیات بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ کندن چپراسی کا خاکہ اسی لیے یادگار بن گیا ہے۔ 'گنج ہائے گراں مایہ'، 'ہم نفسانِ رفتہ' اور 'ہمارے ذاکر صاحب' لکھ کر انھوں نے اردو غیر افسانوی ادب میں قیمتی اضافہ کیا ہے۔

خاکہ نگاری کے رجحان نے بہت کم عرصے میں بہترین ادیبوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ لطف کی بات یہ رہی کہ اہم اور سرکردہ شخصیات کے ساتھ عام آدمیوں کے خاکے بھی اسی خلوص اور دل چسپی سے لکھے گئے اور قارئین نے بھی ہر اچھے خاکے کی پذیرائی کی۔ خاکوں کی کام یابی میں شخصیت کی دل پذیری اور اسلوب کی لطافت کے ساتھ، مشاہیر کی نجی زندگی میں جھانکنے کے فطری تجسس نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ بہر حال بڑی تعداد میں خاکے لکھے گئے اور اب بھی لکھے جا رہے ہیں۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں افسانے کے بعد قبولِ عام کی سند اسی صنف کو نصیب ہوئی ہے۔

ذیل میں اردو کے اہم خاکہ نگاروں کی ایک مختصر فہرست پیش کی جا رہی ہے:

سعادت حسن منٹو	گنجے فرشتے، شخصیات
محمد طفیل (مدیرِ نقوش)	آپ، صاحب، جناب، مکرم و محترم

شاہد احمد دہلوی	گنجینۂ گوہر، بزمِ خوش نفساں، طاقِ نسیاں
خواجہ غلام السیدین	آندھی میں چراغ
الطاف حسین قریشی	ملاقاتیں
علی جواد زیدی	آپ سے ملیے، ہم قبیلہ
شورش کاشمیری	چہرے
سید عابد حسین	کیا خوب آدمی تھا
احمد ندیم قاسمی	میرے ہم سفر
عنوان چشتی	عکس و شخص
صالحہ عابد حسین	جانے والوں کی یاد آتی ہے
مالک رام	وہ صورتیں الٰہی
ندا فاضلی	چہرے
یوسف ناظم	ذکرِ خیر
مجتبیٰ حسین	آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ، ہوئے ہم دوست جس کے
انیس قدوائی	اب جن کے دیکھنے کو
انور ظہیر خان	مت سہل ہمیں جانو

3.3.2 مولوی عبدالحق کے سوانحی کوائف اور ادبی خدمات

مولوی عبدالحق ۲۰ راپریل ۱۸۷۰ء کو ضلع میرٹھ کے ایک قصبے ہاپڑ / ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے بزرگ ہاپوڑ کے ہندو کائستھ تھے جنھوں نے عہدِ مغلیہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ مغلیہ دربار سے وابستگی کے بعد اس خاندان کو کچھ خصوصی مراعات اور معافیاں حاصل ہوئی تھیں جنھیں بعد میں انگریزی حکومت نے بھی بحال رکھا۔ مولوی عبدالحق کی ابتدائی تعلیم پنجاب میں ہوئی جہاں اُن کے والد ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ مولوی صاحب کو سرسید سے غائبانہ تعارف یہی حاصل ہوا۔ اپنے ایک دوست کے گھر انھوں نے تہذیب الاخلاق کے پرچوں کا مطالعہ کیا اور اسی نے اُن کے دل میں علی گڑھ کی تڑپ پیدا کی۔ انھوں نے فیروز پور (پنجاب) میں رہتے ہوئے ۱۸۸۸ء میں مڈل اسکول پاس کیا۔ شیخ علی حسن ہاپوڑ واپس آئے اور انھوں نے عبدالحق کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ میں داخل کرایا۔ یہ

ہاپوڑ کا پہلا لڑکا تھا جسے انگریزی تعلیم کے لیے علی گڑھ کالج کے اسکول میں داخل کیا گیا۔ علی گڑھ میں اُن کا داخلہ تعلیم سال ۸۹۔۱۸۸۸ء میں نہم جماعت میں ہوا تھا، اگلے چھے برسوں میں انھوں نے کام یابی کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ۱۸۹۴ء میں گریجویشن مکمل کیا۔ بچپن ہی سے مولوی صاحب بہت خاموش طبیعت تھے۔

علی گڑھ کالج میں اُن کے جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ اپنے ایک اردو مضمون پر انھیں لارڈ لینس ڈاؤن تمغۂ انعام میں ملا۔ اُن کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے سر سید نے اپنے رسالے 'تہذیب الاخلاق' میں ان سے کام لینا شروع کیا۔ سر سید کی روشن خیالی، محنت اور خلوص نے مولوی عبدالحق کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ تحقیق و تدوین میں مولوی عبدالحق نے جس دقتِ نظری اور مستقل مزاجی کے مثالی نمونے پیش کیے ہیں، یہ اسی تربیت کا نتیجہ ہیں۔ سر سید کے مشورے اور سفارش پر انھوں نے ۱۸۹۵ء میں محسن الملک کے پرائیوٹ سیکریٹری کی ملازمت اختیار کی۔ محسن الملک کی معیت میں کچھ وقت گزرا۔ اُن پر بھی مولوی عبدالحق کے جوہر کھلے اور انھوں نے اپنے سفارشی خط کے ساتھ انھیں حیدرآباد دکن روانہ کیا۔ یہاں انھیں بطور مترجم کام کرنے کا موقع ملا۔ ۱۸۹۹ء میں وہ مدرسۂ آصفیہ، حیدرآباد کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ اسی سال انھیں رسالۂ 'افسر' کی ادارت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ۱۹۱۱ء میں انھیں اورنگ آباد میں مہتمم تعلیمات کے اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں انھیں 'انجمن ترقیِ اردو' کا سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ انجمن کے پہلے سیکریٹری شبلی نعمانی تھے۔ مولوی عبدالحق کی صلاحیتوں اور محنتِ شاقہ کا اعتراف ہی تھا کہ انھیں لگاتار اہم ذمے داریاں تفویض کی جارہی تھیں اور وہ خود بھی صاحبانِ اقتدار کی توقعات دل جمعی سے پوری کر رہے تھے۔ اپنے خاکے 'نام دیو مالی' میں انھوں نے لکھا ہے:

''کام اسی وقت کام ہوتا ہے جب اس میں لذّت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔''

۱۴؍اگست ۱۹۱۷ء کو حیدرآباد میں 'دارالترجمہ' کا قیام عمل میں آیا اور مولوی عبدالحق کو اس کا پہلا ناظمِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ دارالترجمہ کے قیام کا بنیادی مقصد جامعہ عثمانیہ کے لیے نصاب اور کتب کی تیاری تھا۔ اگست ۱۹۱۹ء میں جامعہ عثمانیہ کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے اورنگ آباد سے ایک سہ ماہی رسالہ 'اردو' جاری کیا۔ اردو رسائل کی تاریخ میں اس رسالے نے اپنا مقام بنایا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری کا 'محاسنِ کلامِ غالب' اور اختر حسین رائے پوری کا 'ادب اور سماج' جیسے یادگار مضامین پہلی مرتبہ مولوی عبدالحق کی ادارت ہی میں شائع ہوئے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں اورنگ آباد کالج کا قیام عمل میں آیا اور مولوی عبدالحق کو کالج کا پہلا پرنسپل بنایا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے رسالہ 'نورس' جاری کیا۔ ۱۹۲۹ء تک اورنگ آباد کالج سے وابستہ رہے پھر یہاں سے پنشن لی اور جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسی سال مولوی وحید الدین سلیم کا انتقال ہوا تھا جو جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ مولوی عبدالحق سے زیادہ باصلاحیت اور ذی علم کون ہوسکتا تھا جو اس اہم ذمہ داری کو سنبھالے۔ ۱۹۳۷ء میں مولوی صاحب نے ''اسٹینڈرڈ

انگریزی اردو لغت'' کو مکمل کیا اور اسے اورنگ آباد سے شائع کروایا۔ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے استعفیٰ دیا اور انجمنِ ترقیِ اردو کے دفتر کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے۔ یہاں انھوں نے اپنا وقت اور صلاحیتیں انجمن کی ترقی کے لیے وقف کر دیں، اس کی از سرِ نو تشکیل کر کے اسے تحفّظ و ترقیِ زبانِ اردو کے لیے بے حد فعّال بنایا۔ قیامِ حیدر آباد کے دوران میں مولوی عبدالحق نے غیر معمولی تحقیقی و ادبی کارنامے انجام دیے، ان کی مختصر فہرست درج ذیل ہے:

۱ دکنی ادبیات کی دریافت اور ان کی تدوین

۲ ''قواعدِ اردو'' کی جدید اور آسان انداز میں ترتیب

۳ ''لغتِ کبیر'' کی تالیف کا آغاز (۱۹۴۷ء میں اس کا بیش تر حصّہ دہلی کے ہنگاموں اور فسادات کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اس کام کو دوبارہ شروع کیا۔)

۴ اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری کی تیاری اور اشاعت

مولوی عبدالحق نے انجمنِ ترقیِ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے اردو زبان کو اُس کا حقیقی مقام دلانے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کی۔ آزاد ہندستان میں اردو زبان کے مقام و مستقبل سے متعلق وہ بہت زیادہ فکر مند تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے اربابِ سیاست سے بحث و مباحثہ بھی کیا اور خط و کتابت بھی۔ ۱۹۴۹ء میں مولوی صاحب نے پاکستان ہجرت کی۔ وہاں بھی لگاتار زبانِ اردو کی آب یاری کرتے رہے۔ اسی مقصد کے تحت انجمنِ ترقیِ اردو، پاکستان کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۵۰ء میں 'اردو کالج' قائم کیا۔ مولوی صاحب نے تا عمر شادی نہیں کی اور گھر پریوار بسانے کی کوشش نہیں کی۔ انھیں اردو زبان سے بے پناہ عشق تھا اور اس کی ترقی کا جنون انھیں زندگی کی ہر راحت سے زیادہ عزیز تھا۔ بہر حال اردو زبان کا یہ جاں باز سپاہی ۱۶/اگست ۱۹۶۱ء کو کراچی میں انتقال کر گیا۔

مولوی عبدالحق کی مرتبہ، مؤلفہ اور مصنفہ کتابیں :

نکات الشعرا	دیوانِ تاباں	گلشنِ عشق	قطب مشتری	تذکرۂ ریختہ گویاں
دیوانِ اثرؔ	مخزن الشعرا	ریاض الفصحا	عقدِ ثریّا	تذکرۂ ہندی
چمنستانِ شعرا	ذکرِ میرؔ	مخزنِ نکات	قواعدِ اردو	معراج العاشقین
باغ و بہار	سب رس	چند ہم عصر	مرحوم دہلی کالج	گارساں دتاسی
انتخابِ کلامِ میرؔ	دریائے لطافت	گلِ عجائب	انتخابِ داغؔ	اردو صرف و نحو

سرسید احمد خان۔حالات و افکار نصرتی۔حالات اور کلام پر تبصرہ کہانی رانی کیتکی اور اودھے بان کی

خطبات افکارِ حالی پاکٹ انگریزی اردو ڈکشنری اسٹوڈنٹس انگریزی اردو ڈکشنری

اردو انگریزی ڈکشنری اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری لغتِ کبیر جلد اوّل

اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام

3.3.3 مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

مولوی عبدالحق نے اپنے معاصرین کی سیرتیں لکھی ہیں۔ 'چند ہم عصر' میں چوبیس خاکے ہیں۔ ان میں سے ایک خاکہ 'پروفیسر مرزا حیرت' اُن کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ بقیہ تیئیس سیرتیں اُن کے نوکِ قلم سے تحریر ہوئی ہیں جن میں سے کچھ مختصر ہیں اور کچھ طویل۔ مولوی صاحب نے اپنے معاصرین کو بے لاگ انداز میں پیش کیا ہے۔ اپنی ذاتی پسند اور ناپسند سے زیادہ اپنے مشاہدے، مطالعے اور اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول کو شخصیت و سیرت کا آئینہ بنایا ہے۔ انھوں نے مواد کی فراہمی میں کاوش کی ہے اور افراد کی زندگی اور کارناموں کا تجزیہ کرنے میں اعلیٰ اخلاقی معیار کو مدِّ نظر رکھا ہے۔ ان کے موضوعات میں طبقۂ اشرافیہ سے متعلق، علم و فضل اور جاہ و حشمت والی شخصیات بھی ہیں اور عام زندگی گزارنے والے معمولی افراد بھی۔ مولوی صاحب نے نہ مدح میں غلو سے کام لیا ہے اور نہ تنقیصی انداز اپنایا ہے۔ انھوں نے انسان کو بہ حیثیت انسان پیش کیا ہے، جو خوبیوں اور کمزوریوں کا پیکر ہے۔ اُن کے عہد کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہی ایک خوبی، انھیں اپنے دیگر معاصرین سے ممتاز کرنے کے لیے کافی ہے۔

مولوی صاحب کے خاکوں کی اہم ترین خوبی اُن کے نثر کی سادگی اور بے تکلفی ہے۔ ان کی نثر بلا شبہ دل کش اور دل نشین ہے۔ ہر قسم کے تصنع اور بناوٹ سے پاک، رواں دواں نثر، اپنے قارئین کو باندھے رکھتی ہے۔ مولوی صاحب ہمیں نہ صرف اپنے تجربات میں شریک کرتے چلے جاتے ہیں بلکہ زندگی کے کتنے ہی راز سمجھ میں آتے ہیں اور اخلاق و کردار کے اعلیٰ معیار ہمارے شعور کی تربیت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ مولوی صاحب واقعات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کے اچھے اور برے نتائج اور ان کے دوررس اثرات پر بھی ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔ ان کی نصیحتیں خشک وعظ نہیں بنتیں لیکن ان کا ہر جملہ زندگی کا نیا درس ضرور دیتا ہے۔ مولوی صاحب کے بعض جملے تو فریم کر کے لگائے جانے کے قابل ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

> ''زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی نام وری اور کام یابی کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ بڑھتے ہوئے کو گرانا اور اٹھتے ہوئے کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ اس میں انھیں خوشی ہوتی ہے۔

کبڑی بڑھیا کی طرح اوروں کو بھی کبڑا دیکھنے سے ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔''

''کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذّت آنے لگے۔ بے مزا کام، کام نہیں بیگار ہے۔''

''نیکی اس وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے، جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔''

مولوی صاحب نے اہم سے اہم حقیقت اور گہرے سے گہرا نکتہ عام بول چال کی زبان میں بڑی سلاست اور روانی سے ادا کیا ہے۔ الفاظ نپے تلے، جملے چھوٹے چھوٹے اور دل میں اتر جانے والے ہیں۔ وہ محاورے اِس بے تکلفی اور برجستگی سے استعمال کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے انھیں مواقع کے لیے بنے ہیں۔ تراکیب میں ندرت کم برجستگی زیادہ ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کے خاکوں کی بنیاد حقیقت وصداقت ہے۔ انھوں نے تخیّل اور جذباتی رنگ آمیزی سے زیادہ 'احوالِ واقعی' کو سادگی سے پیش کیا ہے۔ برسوں کے تجربات نے انھیں جس شخص سے متاثر کیا، اس کی زندگی کے واقعات بطور گواہ پیش کر دیے۔ واقعات کا انتخاب ایسا کہ موضوع کے شخصی اوصاف یا کمزوریاں خود بخود قاری پر آشکار ہو جائے۔ شخصیت چاہے عزیز ترین دوست 'مولوی وحید الدین سلیم' کی ہو یا ایک معمولی انسان 'نام دیو مالی' کی، مولوی صاحب انسانی عظمت و وقار کے عناصر و مظاہر سامنے رکھ کر کردار نگاری کرتے ہیں۔ 'سید محمود مرحوم' کے خاکے میں موجود یہ جملہ اُن کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا ہے:

''دوستو! دنیا میں نہ نہیں خالص نیکی پائی جاتی اور نہ خالص بدی، اسی طرح نہ انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا۔۔۔''

مولوی صاحب کی نثر کو ہم سر سید احمد خان کی نثر کی ترقی یافتہ شکل کہہ سکتے ہیں جس میں درمیانی کڑی حالؔی کی نثر ہے۔ مولوی صاحب نے عبارت آرائی اور انشا پردازی کے جوہر دکھانے سے زیادہ سلاست، سادگی اور طبیعت کے فطری خلوص سے قارئین کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے پُرسکون زندگی گزارنے اور اچھا انسان بننے کے لیے جن صالح اقدار کو لازمی سمجھا، اپنے موضوعات کے حوالے سے انھیں اُجاگر بھی کیا اور شاید موضوعات کے انتخاب میں انھیں، اپنی اسی فطرت سے رہنمائی حاصل ہوئی ہوگی۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ 'خاکہ'' کسے کہتے ہیں وہ کس طرح دوسری اصناف سے مختلف ہوتا ہے؟

۲۔ اردو کے اولین خاکہ نگار کائن ہیں؟ ان کے خاکوں کے نام لکھیے۔

۳۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ کس نام سے شائع ہوا؟

۴۔ رشید احمد صدیقی کا کون سا خاکہ یادگار بن گیا؟

۵۔ چراغ حسن کاشمیری کے تحریر کردہ خاکوں کے مجموعے کا کیا نام ہے؟

3.4 رشید احمد صدیقی

3.4.1 اردو میں انشائیہ نگاری اور رشید احمد صدیقی کا عہد

اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز کب ہوا، یہ سوال بھی بہت اہم اور دل چسپ ہے۔ جن ناقدین نے صرف بے تکلف اور رواں نثر کو انشائیہ کی فنی شناخت کا وسیلہ سمجھا، ان کے نزدیک اردو کے اولین مضمون نگار مثلاً ماسٹر رام چندر اور سر سید احمد خان وغیرہ اردو کے اولین انشائیہ نگار قرار پائے۔ انھوں نے سرسید کے رفقا مثلاً حالیؔ، محسن الملک، مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور وحید الدین سلیم وغیرہ کے مضامین کو بھی انشائیہ کے زُمرے میں رکھا۔ بلاشبہ ان بزرگوں نے سادہ اور بے تکلف نثر نگاری کو فروغ دینے کی کوشش کی لیکن ان کی مقصدیت اور موضوع کے تئیں سائنٹفک رویہ، ان کے مضامین کو انشائیہ کہنے میں مانع ہے۔ ان اصلاحی مضامین میں رنگینی، شگفتگی اور انکشافِ ذات کے جوہر نہیں ملتے۔ ان مضامین میں کیف و سرور کی اُس لہر کو تلاش نہیں کیا جاسکتا، جو انشائیہ نگار اور قاری، دونوں کو سرشار کرتی ہے۔ اس عہد کے قلم کاروں میں مولوی محمد حسین آزادؔ کو استثنا قرار دیا جاسکتا ہے۔ آزاد کے اسلوب میں رنگینی اور لطافت بھی ہے اور غنائیت بھی۔ اگرچہ 'نیرنگِ خیال' کے تمام مضامین مغربی شہ پاروں کا ترجمہ ہیں جنھیں آزادؔ نے اپنی خلاقی سے مشرقی فضا عطا کی ہے، لیکن ندرتِ بیان اور جدّتِ اظہار نے اِن تمثیلی مضامین کو 'انشائیہ' سے بہت قریب کردیا ہے۔ اس عہد کے اہم ادیبوں میں شبلی نعمانی اور عبدالحلیم شررؔ کی نثر بھی قابلِ توجہ ہے لیکن شبلی تحقیق و سیرت کے مردِ میدان تھے اور شررؔ نے تاریخی ناولوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اس کے باوجود رسالہ 'دل گداز' میں چھپے شررؔ کے مضامین ندرتِ بیان اور تازہ کار تحریر کی بنا پر انشائیہ کے اولین نمونوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ بطورِ خاص اچھوتا پن، لالۂ خودرو، باغِ آرزو اور حاضر جواب جوتا وغیرہ لائقِ تحسین ہیں۔ بعض ناقدین میر ناصر علی کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ہفت روزہ اخبار

’صلائے عام‘ میں ’افکارِ پریشاں‘ کے عنوان سے ایک کالم شروع کیا تھا جس کے مضامین غیر رسمی انداز اور منتشر خیالی کا نمونہ تھے۔ میر ناصر علی کی عبارت آرائی اور انشا پردازی، فرحت بخش اور حسن آفریں بھی تھی۔ اردو نثر کا کارواں رواں دواں تھا۔ جوں جوں اخبارات و رسائل کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، لکھنے والوں کی نئی اور تازہ دم فوج سامنے آ رہی تھی۔ سجاد حیدر یلدرم، مہدی حسن اِفادی، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریا آبادی، خواجہ حسن نظامی، سجاد انصاری، محفوظ علی بدایونی، فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری وغیرہ میں سے ہر ایک نے اردو نثر کی آب یاری کرنے اور اسے رنگ و آہنگ عطا کرنے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو صرف کیا۔ ان میں سے بعض ادیبوں نے لطفِ زبان اور ندرتِ خیال کو فوقیت دی اور بعض نے طنز و مزاح کے سہارے اپنے مشاہدات و تجربات قارئین تک پہنچائے۔ آزادی سے پہلے اردو میں انشائیہ نگاری کا فروغ ان ہی تازہ کار قلم کاروں کا مرہونِ منت ہے۔

اردو زبان و ادب کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بے شمار سوغاتیں دی ہیں، ان میں سے ایک بیش قیمت سوغات رشید احمد صدیقی بھی ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے تحقیق و تنقید، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری اور مکتوباتی ادب میں اپنے ذہن و قلم کے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اردو طنز و مزاح نگاری کی تاریخ میں ان کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کا شمار اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کے انشائیوں میں اعلیٰ پائے کی ظرافت اور شائستگی کے ساتھ زبان کا ایک خاص معیار ملتا ہے۔ انھوں نے قارئین کے ذوق کی تسکین کرنے سے زیادہ اُن کی سطح بلند کرنے کی کوشش کی اور یقیناً اس میں کام یابی حاصل کی۔ ان کے انشائیوں، خاکوں اور تحقیقی و تنقیدی مضامین میں زبان و بیان کا لطف بھی ہے اور فکر و نظر کی تربیت کا سامان بھی۔ ان کی کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

آشفتہ بیانی میری	خنداں	گنج ہائے گراں مایہ	ہم نفسانِ رفتہ
مضامینِ رشید	جدید غزل	ذاکر صاحب	غالبؔ کی شخصیت اور شاعری
خطوطِ رشید احمد صدیقی	کشاف قانونی اصطلاحات		

3.4.2 رشید احمد صدیقی کے سوانحی کوائف

رشید احمد صدیقی یو پی کے ضلع جون پور کے ایک گاؤں مڑیا میں ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالقدیر صاحب اضلاع بلیا، غازی پور اور جون پور میں سب انسپکٹر رہے۔ ان کی فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں جون پور کے ایک مکتب میں داخلہ ہوا۔ انھوں نے ۱۹۱۴ء میں یہاں سے انٹرنس پاس کیا اور مالی حالت سے مجبور ہو کر جون پور کی دیوانی عدالت میں عارضی کلرک کی ملازمت کرنے پر مجبور ہو

ئے۔ ۱۹۱۵ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ آئے اور ایم۔اے۔او، علی گڑھ کالج میں فرسٹ ایر میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء تک یہاں زیرِ تعلیم رہے۔ آپ نے طالب علمی کے زمانے میں ادبی سرگرمیوں میں خوب حصّہ لیا۔ طالبِ علمی کے زمانے ہی سے مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کیے۔ علی گڑھ میگزین کے کئی مرتبہ ایڈیٹر بنائے گئے۔ چناں چہ ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور فارسی میں ایم اے کیا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ کالج میں اردو اور فارسی پڑھانے کے لیے تین مہینوں کے لیے عارضی تقرر ہوا۔ پھر جب یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا تو اردو کے عارضی لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں یہ ملازمت مستقل ہوئی۔ اس کے ترقی کی راہیں اُن پر کھلتی گئیں۔ ۱۹۳۵ء میں شعبۂ اردو میں ریڈر کا عہدہ ملا، ۱۹۴۳ء میں صدرِ شعبۂ اردو بنائے گئے۔ ۱۹۴۵ء میں اسی عہدے پر رہتے ہوئے پروفیسر شپ ملی۔ مرکزی وزارتِ تعلیم کی ایک اسکیم کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ انھیں جنرل ایجوکیشن کی کتابوں کی تیاری کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ یکم مئی ۱۹۵۸ء کو ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ رٹائرمنٹ کے بعد اسی شہر میں مستقل سکونت اختیا کی۔ انھیں علی گڑھ سے بے پناہ عشق تھا۔ ان کی تحریروں میں اس شہر کی تہذیب سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ شعر و ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے اور ادب کے اچھے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی زندگی شرافت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے انھیں ۱۹۶۳ء میں 'پدم شری' کا خطاب عطا کیا۔ اپنی تصنیف 'غالبؔ کی شخصیت اور شاعری' پر ۱۹۷۱ء میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ تقریباً چوراسی سال کی عمر میں ۱۵؍جنوری ۱۹۷۷ء کو علی گڑھ کے اس سپوت کا انتقال ہوا اور وہ اسی شہر میں مدفون ہوئے۔

3.4.3 رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری

رشید احمد صدیقی نے ایک مضمون 'اپنی یاد میں' میں خود اپنے طرزِ نگارش پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا یہ مضمون 'مضامینِ رشید' میں شامل ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے تھے، مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں۔ ان مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور بہکی بہکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے مطابق تھیں۔ میں خود نہیں بہکتا تھا۔ دوسروں کو بہکنے کی فرصت دیتا تھا۔ عقل کی باتیں دیر تک نہ سنی جاسکتی ہیں اور نہ سنائی جاسکتی ہیں۔''

صرف اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انشائیہ نگاری کے فن سے پوری طرح واقف تھے اور اسی لیے انشائیہ نگاری کے جملہ خواص ان کے فن پاروں میں ملتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار ہیں۔ طنز و مزاح نگاری کوئی مستقل صنف نہیں بلکہ دراصل یہ طبیعت کا رنگ ہوتا ہے جو کسی بھی صنف میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے خاکوں

اور انشائیوں میں ان کی طبیعت کا یہ رنگ، بڑی شائستگی کے ساتھ اجاگر ہوا ہے اور اسی لیے انھیں باذوق و باشعور قارئین کا حلقہ نصیب ہوا۔ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ اپنے موضوع کے باریک سے باریک پہلوؤں تک ان کی نظر پہنچتی ہے اور اسی لیے وہ مضحک پہلو کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں چارپائی، ارہر کا کھیت، گواہ، مغالطہ، دھوبی، حاجی صاحب، الیکشن، اپنی یاد میں، پاسبان، آمد میں آورد، مرشد، حاجی صاحب وغیرہ ہر ایک میں قارئین ایسے تجربات و مشاہدات کا شریک بن جاتا ہے، جو شاید اس کے تخیل و تصور میں کبھی نہ آتے۔ رشید صاحب لگاتار اپنے قارئین سے گفتگو کرتے چلے جاتے ہیں اور انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کے سامنے ایک وسیع کائنات ہے اور اس کی سیر کا حوصلہ اور وسائل بھی۔ شعور کی ایک لہر ہے جو قارئین کو اپنی گرفت میں لیے عقل و خرد کے رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھاتے ہوئے چلی جارہی ہے۔ بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور ہر بات نہایت ضروری اور بھلی معلوم ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے اسلوبِ نگارش پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے اپنی کتاب 'اردو مضمون کا ارتقا' میں لکھا ہے:

''رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں مزاح کی پھُل جھڑیاں روزمرہ کے واقعات کے گرد چھوٹتی ہیں، مثال کے طور پر 'ہوٹل میں ریڈیو، سفر، دعوت، باغ، امتحانات اور 'الیکشن' ملاحظہ ہوں۔۔۔۔۔ صفحہ ۱۹۲

رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں اکثر جگہ ڈرامائی کیفیت کا لطف پیدا ہوتا ہے۔۔۔ صفحہ ۱۹۲

رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں طنز کی کاٹ موجود ہوتی ہے لیکن ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ یہ دھار ان کے انشائیوں میں کہیں تلخ گوئی اور پھبتی کی شکل اختیار نہیں کرتی۔۔۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے طنز میں بڑی نرمی اور مٹھاس بھر دیتے ہیں۔۔۔ صفحہ ۱۹۳۔ ۱۹۲

رشید احمد صدیقی کی ظرافت کا بڑا انحصار واقعات کی ترتیب، ان کے محلِ وقوع کے ساتھ ساتھ ان کے تبسم ریز فقروں، ان کے اسلوب کی گدگداہٹ اور ان کی مخصوص لفظیات پر ہوتا ہے۔۔۔'' صفحہ ۱۹۵

رشید احمد صدیقی نے اکثر مضامین ریڈیو والوں کی فرمائش پر لکھے ہیں۔ ایسے تمام مضامین میں ظاہر ہے اُن کا انداز خطیبانہ ہے اور ان کے پیشِ نظر سامعین کا ایسا طبقہ ہے جو ادبی موضوعات کو سننے اور زبان و بیان سے لطف اندوز ہونے کے لیے ریڈیو کے کان پیلتا ہے۔ موضوع کا انتخاب کرتے وقت بھی انھیں اپنے سامعین کی پسند کا لحاظ کرنا پڑتا

تھا۔انھوں نے زیادہ تر اپنی علاقائی تہذیب اوراس سے وابستہ افراد کوموضوع بنایا ہے۔ان کے مضامین میں جو اشارے اور استعارے استعمال ہوئے ہیں، علی گڑھ کے تعلیمی، تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں سے واقف قارئین اُن سے خوب لطف اُٹھاتے ہیں۔اس کے باوجود اُن کی ظرافت کو محدود نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ 'انشائیہ' میں موضوع تو صرف ایک بہانہ ہوتا ہے اور انشائیہ نگار اس مرکز سے سو مرتبہ گریز کرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتا۔رشید صاحب بھی بات کرتے کرتے مرکز سے ہٹ جاتے ہیں اور ''ہاں میں کہہ رہا تھا'' اور '' آمد برسر مطلب'' کہہ کر اصل بات پر آجاتے ہیں۔اُن کی خوبی یہ ہے کہ قاری کے لیے موضوع غیر دل چسپ بھی ہو تو عبارت کی شگفتگی اور ظریفانہ طرزِ استدلال، اُسے باندھے رکھتا ہے۔البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ان کے انشائیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے علمی لیاقت اور ذہانت کی ایک مطلوبہ سطح درکار ہے۔

رشید احمد صدیقی کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی نے اردو انشائیے کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ان کے اسلوب کے اثرات نہ صرف معاصرین بلکہ بعد میں آنے والے ادیبوں کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں۔رشید احمد صدیقی کے انشائیے اسلوب کی تازگی، زبان و بیان کی شوخی، جدتِ اظہار اور نکتہ آفرینی کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔کسی نے لکھا ہے کہ ان کا ہر ظریفانہ جملہ کسی نہ کسی سنجیدہ مقصد کے بطن سے جنم لیتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ان انشائیوں میں بکھرے علم وحکمت کے بے شمار موتی، قارئین کی فکر کو نئے زاویے عطا کرتے رہیں گے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ 'انشائیہ' کسے کہتے ہیں؟ اس کی اہم خصوصیات واضح کیجیے۔

۲۔ عنوان سے متعلق انشائیہ کی ایک خوبی کون سی ہے؟

۳۔ ناقدین نے کن اولین مضمون نگاروں کو اردو کا اولین انشائیہ نگار قرار دیا؟

۴۔ ''رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں مزاح کی پھُل جھڑیاں روزمرہ کے واقعات کے گرد چھوٹتی ہیں، مثال کے طور پر 'ہوٹل میں ریڈیو، سفر، دعوت، باغ، امتحانات اور 'الیکشن' ملاحظہ ہوں۔''
یہ کس کا قول ہے؟

۵۔ رشید احمد صدیقی کی کس تصنیف پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا؟

3.5 کرشن چندر

3.5.1 کرشن چندر کے معاصر افسانہ نگار

کرشن چندر کے معاصرین میں سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، اپندر ناتھ اشک خواجہ احمد عباس وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اس دور کے تمام افسانہ نگار فکری و عملی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نہ صرف اشتراکیت ہی کو انسانوں اور انسانیت کے تمام مسائل کا حل سمجھتا تھا بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے اشتراکی انقلاب کے لیے راہیں ہموار کرنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے اردو کو بہترین افسانے دیے۔ ان افسانہ نگاروں نے زندگی کے مسائل پورے خلوص اور فن کاری سے پیش کیا۔ ہر افسانہ نگار کی اپنی شناخت قائم ہوئی۔ کرشن چندر اپنے معاصرین میں ایک خاص امتیازی اسلوب سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ منٹو کا اپنا الگ رنگ ہے۔ ان کے قلم میں بے باکی ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کی خود ساختہ اقدار سے بغاوت کی ہے۔ زندگی کے مختلف مظاہر اور عناصر کا تجزیہ کرتے وقت ان کا قلم کچھ زیادہ سفاک ہو جاتا ہے۔ جنسیات پر لکھنے کی وجہ سے منٹو کو بہت ساری مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، ان پر، مقدمے قائم ہوئے، انھیں عدالت کے چکر کاٹنے پڑے لیکن بالآخر وہ سنجیدہ اور باشعور قارئین کو اپنا ادبی نقطۂ نظر سمجھانے میں کام یاب ہوئے۔ کرشن چندر کے دیگر معاصرین میں ایک بہت بڑا نام راجندر سنگھ بیدی کا ہے۔ متوسط طبقے کے سماجی اور نفسیاتی مسائل کو بیدی نے غیر معمولی فن کاری سے پیش کیا ہے۔ منٹو کے مقابلے میں بیدی کے قلم میں زیادہ تنظیم اور رکھ رکھاو پایا جاتا ہے۔ ان کا خاص موضوع عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کے مسائل کو سماج کے گوش گزار کرنا تھا۔ گرم کوٹ، تلادان، رحمٰن کے جوتے، لاجونتی، اپنے دکھ مجھے دے دو، گرہن، ایک باپ بکاو ہے، کوارنٹین، پان شاپ، ٹرمینس سے پرے جیسے افسانوں میں بیدی کے تجزیہ نگار قلم کا عروج دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے نسوانی کردار زیادہ طاقت ور اور زندگی سے بھرپور ہیں۔ عصمت چغتائی نے شمالی ہندستان کے متوسط خاندانوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان مشترکہ خاندانوں میں خاص طور سے عورتوں کے مسائل کو عصمت نے بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی ان کے افسانے منفرد ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کے مسلم دیہاتوں کی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے مسلم جاگیرداروں اور محنت کش عوام کی طبقاتی کشمکش کو بھی پیش کیا ہے اور اپنے سماج سے ہم آہنگ نہ ہونے والے افراد کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انھیں اپنے قارئین کو اعتماد میں لے کر کہانی سنانے کا فن آتا ہے۔ کرشن چندر کے ابتدائی افسانے خالص رومانی ہیں لیکن آہستہ آہستہ اُن کے قلم نے اپنا اصل میدان تلاش کر لیا گو کہ رومانیت ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔ کرشن چندر نے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ لکھا اور اپنے عہد میں وہ سب سے زیادہ پسند کیے گئے۔ انھوں شہروں میں زندگی بسر کرنے والے

غریبوں کے حقیقی مسائل تک پہنچنے کی کوشش بھی کی اور دولت وشہرت کے لیے سیٹھ ساہوکاروں کی بے لگام حرص اور بیمار ذہنیت کو بھی نشانہ بنایا۔امیروں کی جنسی بے راہ روی اور مجبور عورتوں کے استحصال کو اجاگر کرنے میں کرشن چندر کا قلم زیادہ کام یاب رہا ہے۔

3.5.2 کرشن چندر کے سوانحی کوائف اور ادبی خدمات

کرشن چندر 23 نومبر 1914 کو راجستھان کے شہر بھرت پور میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد گوری شنکر چوپڑا میڈیکل افسر تھے۔بعد میں انھوں نے اس وقت کی ریاست پونچھ میں ملازمت کر لی تھی۔کرشن چند کا بچپن وہیں گزارا۔کرشن چندر نے تحصیل مہندر گڑھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔اردو انھوں نے پانچویں جماعت سے پڑھنی شروع کی اور آٹھویں جماعت میں اختیاری مضمون فارسی لے لیا۔فارسی کے استاد بلاقی رام نندہ اُن کی بہت پٹائی کرتے تھے۔کرشن چند نے ان پر اک مضمون "مسٹر بلیکی" لکھ کر دیوان سنگھ مفتوں کے اخبار "ریاست 'میں بھیج دیا جو شائع بھی ہو گیا۔اس مضمون کی علاقہ میں بہت شہرت ہوئی اور لوگوں نے اسے مزے لے لے کر پڑھا لیکن والد سے ڈانٹ ملی۔کرشن چندر نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویزن میں وکٹوریہ ہائی اسکول سے پاس کیا۔جس کے بعد انھوں نے لاہور کے فارمن کرسچین کالج میں داخلہ لے لیا۔اسی زمانہ میں ان کی ملاقاتت بھگت سنگھ کے ساتھیوں سے ہوئی اور وہ انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔انھیں گرفتار کر کے دو ماہ لاہور کے قلعہ میں نظر بند بھی رکھا گیا۔ایف اے میں وہ فیل ہو گئے تو شرم کی وجہ سے گھر سے بھاگ کر کلکتہ چلے گئے۔لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کی والدہ ان کے لا پتہ ہو جانے سے بیمار ہو گئی ہیں تو واپس آ گئے۔اس کے بعد انھوں نے سنجیدگی سے تعلیم جاری رکھی اور انگریزی میں ایم اے اور پھر ایل ایل بی کیا۔ انھوں نے ایل ایل بی، والدین کے دباؤ میں کیا تھا اور ان کا کوئی ارادہ وکالت کرنے کا نہیں تھا۔ان کی دل چسپی ادب میں تھی۔انھوں نے مختلف رسالوں کے لئے لکھنا شروع کیا اور ادبی حلقوں میں ان کی شناخت بننے لگی۔اس زمانے میں ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے،"خیال"،"نظارے" اور 'نغمے کی موت" شائع ہو چکے تھے۔جن کو سراہا گیا تھا۔ان کا پہلا ناول ـ' شکست' 1943 میں منظر عام پر آیا۔

کرشن چندر شروع سے ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے اور 1938 میں کلکتہ میں منعقد کی گئی کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں انھوں نے صوبہ پنجاب کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔یہیں ان کا تعارف سجّاد ظہیر اور پروفیسر احمد علی وغیرہ سے ہوا۔اور انھیں انجمن ترقی پسند مصنفین صوبہ پنجاب کا سکریٹری مقرر کر دیا گیا۔1939 میں احمد شاہ بخاری (پطرس) نے، جو آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی ڈائرکٹر تھے، انھیں آل انڈیا ریڈیو لاہور

میں پروگرام اسسٹنٹ کی ملازمت دے دی۔انھوں نے تین سال تک لاہور، دہلی اورلکھنو مین بطور پروگرام اسسٹنٹ کام کیا۔اس وقت دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر سعادت حسن منٹو بھی کام کررہے تھے۔اسی زمانے میں کرشن چندر کی والدہ نے اپنی پسند سے ان کی شادی ودیاوتی سے کردی۔ان کی بیوی معمولی شکل وصورت کی اور تند خو تھیں جن کے ساتھ وہ خوش نہیں تھے۔ ودیاوتی سیان کی دولڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوا۔

کرشن چندر ریڈیو کی ملازمت سے مطمئن نہیں تھے۔اتفاق سے اسی زمانہ مین پونے کی شالیمار فلم کمپنی کے پروڈیوسر/ ڈائرکٹر زیڈ احمد نے ان کا اک افسانہ پڑھا اور انھین ٹیلیفون کر کے اپنی فلم کمپنی میں مکالمے لکھنے کی دعوت دی۔کرشن چند نے ریڈیو کی ملازمت چھوڑ دی اور پونے روانہ ہو گئے۔پونے کا زمانہ کرشن چندر کی زندگی کا یادگار اور رنگین زمانہ تھا۔تخلیقی لحاظ سے بھی یہ ان کا اچھا دور تھا جس میں انھوں نے'ان داتا' اور 'موبی' جیسی کہانیاں لکھیں۔کرشن چندر نے اپنی پسند سے دوسری شادی مشہور ادیب اور علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صاحب زادی سلمٰی صدیقی سے کی۔کرشن چندر کی طرح سلمٰی بھی شادی شدہ تھیں اس لیے ان سے شادی میں بہت مشکلات حائل تھیں۔لیکن سلمی بھی ان کے عشق مین گرفتار تھیں۔انھوں نے اپنے شوہر سے طلاق لی اور کرشن چندر کی شریک حیات بن گئیں سلمی کے ساتھ ان کی زندگی بہت خوشگوار گزری۔

کرشن چندر 1946 میں پونے سے بمبئی چلے آئے۔یہاں ان کو بمبئی ٹاکیز میں ڈیرھ ہزار روپے ماہوار پر ملازمت مل گئی۔اس کمپنی مین ایک سال کام کرنے کے بعد وہ ملازمت ترک کر کے فلموں کے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر بن گئے۔ان کی پہلی فلم سرائے کے باہر" ان کے ایک ریڈیائی ڈرامے پر مبنی تھی۔اس میں ان کے بھائی مہندر ناتھ ہیرو تھے۔فلم بری طرح ناکام ہوئی اس کے بعد انھوں نے فلم راکھ بنائی جوڈبے میں ہی بند رہ گئی اور کبھی ریلیز نہیں ہوئی۔ فلموں کی ناکامی کے نتیجہ مین کرشن چندر عرش سے فرش پر آگئے۔سر پر بھاری قرض کا بوجھ تھا جس کی ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہین آرہی تھی۔انھوں نے اپنی کاریں بیچ دیں،نوکروں کو ہٹادیا اور بمبئی مین قدم جمائے رکھنے کے لئے نئے سرے سے جدوجہد شروع کی۔کرشن چندر نے تقریبا دو درجن فلموں کے لئے کہانی،منظرنامے یا مکالمے لکھے ان میں سے کچھ فلمیں چلیں بھی لیکن بطور فلم رائٹر وہ فلموں میں کوئی بلند مقام نہیں حاصل کر سکے۔1966 میں کرشن چندر کو سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔کرشن چندر نے سلمی صدیقی کے ساتھ روس کا دورہ کیا جہان ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ 1969 میں ان کو پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا گیا۔31 مئی 2017 کو ان کی یاد مین محکمۂ ڈاک وتار نے دس روپے کا ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔کرشن چندر دل کے مریض تھے۔ان کو 1967،1969 اور 1976 مین دل کے دورے پڑے تھے لیکن بچ گئے تھے۔5 مارچ 1977 کو ان کو ایک بار پھر دل کا دورہ پڑا اور وہ 8 مارچ کو چل بسے۔

کرشن چندر کی کتابیں

پروفیسر بیگ احساس (سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی) اپنی کتاب میں کرشن چندر کی تصنیفات کی فہرست کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تصانیف کی مکمل فہرست بنانا بھی کم دشوار مرحلہ نہیں تھا۔ کرشن چندر کے گھر پر بھی ان کی تصانیف کا مکمل سیٹ یا فہرست موجود نہیں ہے۔ رسالہ "شاعر" کے "کرشن چندر نمبر (1967)" میں شائع شدہ فہرست بھی ناقص ہے۔ راقم الحروف نے ایک مکمل فہرست تیار کی۔ محترمہ جیلانی بانو نے ساہتیہ اکیڈمی سے شائع ہونے والی کتاب "کرشن چندر" میں راقم الحروف کی تیار کردہ فہرست میرے حوالے سے شائع کی ہے۔ کرشن چندر کے افسانوی مجموعوں کے ساتھ ان میں شامل افسانوں کی فہرست بھی دی جارہی ہے۔''

ناول: ۴۷ افسانے: ۳۳ر مجموعے

ناول

شکست	1943	جب کھیت جاگے	1952
طوفان کی کلیاں	1954	دل کی وادیاں سوگئیں	1956
آسمان روشن ہے	1957	باون پتے	1957
ایک گدھے کی سرگذشت	1957	ایک عورت ہزار دیوانے	1957
غدار	1960	سڑک واپس جاتی ہے	1961
دادر پل کے بچے (ناولٹ)	1961	برف کے پھول (ناولٹ)	1961
میری یادوں کے چنار ب	1962	گدھے کی واپسی	1962
بوربن کلب	1962	ایک وائلن سمندر کے کنارے	1963
درد کی نہر	1963	لندن کے سات رنگ	
ایک گدھا نیفا میں	1964	چاندی کا گھاؤ	1964
مٹی کے صنم	1966	زرگاؤں کی رانی	1966
کاغذ کی ناؤ		گنگا بہے نہ رات	1966
فلمی قاعدہ (طنزیہ)	1966	پانچ لوفر	1966
پانچ لوفر ایک ہیروئین		ہانک کانگ کی حسینہ	1967
دوسری برف باری سے پہلے	1967	گوالیار کا حجام	1969

بمبئی کی شام		چندا کی چاندنی	1971
ایک کروڑ کی بوتل	1971	مہارانی	1971
پیارا ایک خوشبو (ماخوذ)	1971	مشینوں کا شہر (ماخوذ) دسمبر۔1971	
کارنیوال (ماخوذ) آئینے اکیلے ہیں 1972			
چنبل کی چنبیلی	1973	اس کا بدن میرا چمن	1974
سونے کا سنسار	1976	محبت بھی قیامت بھی	1974
سپنوں کی وادی	1977	آدھا راستہ	1977
ہونولولو کا راج کمار		سپنوں کی رہگذر میں	1977
فٹ پاتھ کے فرشتے 1977			

کرشن چندر کے افسانوی مجموعے

طلسم خیال	1939	نظارے	1940
ہوائی قلعے	1940	گھونگھٹ میں گوری جلے	
زندگی کے موڑ پر	1943	نئے افسانے	1943
نغمے کی موت	1945	پرانے خدا	1944
ان داتا	1944	ہم وحشی ہیں	1947
ٹوٹے ہوئے تارے 1947		تین غنڈے	1948
اجنتا سے آگے	1948	ایک گرجا ایک خندق	1948
سمندر دور ہے	1948	شکست کے بعد	1951
نئے غلام	1953	میں انتظار کروں گا	1953
مزاحیہ افسانے	1954	ایک روپیہ ایک پھول	1955
یوکلپٹس کی ڈالی	1955	ہائیڈروجن بم کے بعد	1955
کتاب کا کفن	1956	دل کسی کا دوست نہیں	1959
کرشن چندر کے افسانے 1960		مسکرانے والیاں	1960

سپنوں کا قیدی	1964	مس نینی تال	1964
دسواں پل		گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو	1967
آدھے گھنٹے کا خدا	1969	الجھی لڑکی کالے بال	1970
کشمیر کی کہانیاں		کبوتر کے خط	
کسان اور دیوتا		کالا سورج	

3.5.3 کرشن چندر کی افسانہ نگاری

مجموعی طور پر کرشن چندر کے افسانوں میں رومان اور حقیقت کا ایک دلکش امتزاج ملتا ہے۔ ان کے افسانے ایک طرف اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں اور سماج کے ظلم وستم کو پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف قدرت کے حسین ودلکش نظاروں اور زندگی کے روشن پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں، غریب عوام سے انتہائی ہمدردی کا جذبہ بھی ملتا ہے، اور کردار نگاری کے عمدہ نمونے بھی۔ بنیادی طور پر کرشن چندر رومان پسند ہیں۔ معاشی وسیاسی حقیقت نگاری کرتے وقت بھی ان کا قلم بہت زیادہ سفاکی کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ ان کی فطری رومانیت ان مناظر میں بھی تلخی کی بجائے توازن پیدا کرتی ہے ۔کرشن چندر کے افسانے اپنے موضوعات کے فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں تنوع بھی ہے اور خود اعتمادی بھی۔ کرشن چندر کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی حقیقت نگاری ہے۔ ہر سچے فن کار کی طرح انھوں نے زندگی کو جس طرح سمجھا ویسا ہی اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی تحریر اور مزاج کی شگفتگی نے ان کے افسانوں کو دوسرے فن کاروں سے ممتاز کیا۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی طنز ومزاح کا سہارا لیا اور جہاں رمز وکنایہ ضروری سمجھا، وہاں مناسب علامتوں کی تخلیق بھی کی۔

کرشن چندر کا پہلا افسانوی مجموعہ 'طلسمِ خیال' تھا جس کے تمام افسانے رومانی ہیں۔ ان افسانوں میں قدرت کے حسین نظارے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے سارے کنایے موجود ہیں۔ کہانیاں بھی حسن وعشق کے نغموں سے معمور اور زندگی کے حقیقی مسائل سے دور، جنتِ ارضی کی سیر کراتی ہیں۔ منظر کشی میں ان کا مقابلہ شاید ہی کوئی دوسرا افسانہ نگار کر پائے گا۔ بہرحال عمر اور حالات کے ساتھ کرشن چندر کی کہانیوں کے مرکز ومحور میں بھی تبدیلی آتی گئی اور ان کی پیش کش اور اسلوب میں نکھار آتا گیا۔ کرشن چندر اپنے دوسرے مجموعے 'نظارے' میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ دو فرلانگ لمبی سڑک، جنت اور جہنم اور بالکنی جیسے افسانے اِس مجموعے میں شامل ہیں، جو زندگی کی سچائیوں کا زیادہ ادراک رکھتے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں میں پلاٹ اور کرداروں سے زیادہ ماحول اور فضا کو اہمیت حاصل ہے۔ ان کے افسانے اپنی بُنت میں راجندر سنگھ بیدی یا احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی طرح مضبوط نہیں ہوتے بلکہ ان میں منٹو کے افسانوں کی طرح کھلا پن محسوس ہوتا ہے۔ ان افسانوں میں ایک ذہنی وسعت اور زندگی کی حقیقتوں کو قبول کرنے کا احساس پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانے فرد سے زیادہ معاشرے کی کہانی سناتے ہیں اسی لیے وہ لافانی کردار تخلیق نہیں کر پاتے بلکہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کردار ہمارے اپنے سماج میں چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں اور کسی مخصوص فضا میں ہم بہ آسانی انھیں پہچان لیتے ہیں۔ کرشن چندر دراصل ہمارے اجتماعی شعور سے علاقہ رکھتے ہیں اور اسے جگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ انسان دوست ہیں اور انسانی فطرت کے روشن پہلو پر نظر رکھتے ہیں اسی لیے وہ افراد کی غلطیوں کے لیے سسٹم کو قصوروار سمجھتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ نظام کی تبدیلی ایسے حالات پیدا کرے گی جہاں افراد نہ صرف اپنی بنیادی ضرورتوں کو آسانی سے حاصل کر سکیں گے بلکہ ایک ایسا معاشرہ بھی تخلیق ہو گو جس میں ہر فرد کو ترقی کرنے کے مواقع میسر آئیں گے۔ بڑھنے، پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے لیے انھیں چور دروازے تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

کرشن چندر کے اکثر افسانوں میں گہری رمزیت اور علامتی انداز پایا جاتا ہے۔ علامتوں کا استعمال وہ ایسی چابک دستی سے کرتے ہیں کہ افسانوں میں ابہام کی کیفیت پیدا ہونے کے بجائے ان کے حسن اور رنگینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بظاہر غیر مربوط ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک مربوط کہانی کی تخلیق کرتے ہیں پھر اپنے جان دار تخیل اور جزیات نگاری کے ذریعہ قاری کے ذہن کو مسحور کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں موضوع کا کال نہیں، نہ ہی موضوع کے لیے انھیں بھٹکنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے اور چھوٹے چھوٹے واقعات کو ذہن میں رکھ کر موضوع منتخب کر لیتے ہیں اور ان کی غیر معمولی تخلیقیت اُس فضا میں نئی کہانی کو جنم دینے لگتی ہے۔ وہ اپنے قارئین کو فلسفیانہ پیچیدگیوں میں نہیں الجھاتے بلکہ ان کا بیان خود قاری کو ساتھ لیتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ انھیں پڑھتے وقت ایک بہاو کا احساس ہوتا ہے۔ قاری چھوٹے چھوٹے واقعات اور دل چسپ متحرک مناظر کا حصّہ بن جاتا ہے۔ کرشن چندر کے کردار اپنے مکالموں کے ذریعے اپنی سماجی حیثیت کی شناخت کراتے ہیں۔ مکالموں میں انھوں نے ہمیشہ سادہ اور فطری زبان استعمال کی اور کہیں بھی تکلف یا صنّاعی کو جگہ نہ دی۔ کرشن چندر کے افسانوں میں مکالموں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے تمام کردار چاہے وہ بہت دولت مند سیٹھ ساہوکار رہوں یا سطح غربت سے نیچے زندگی گزارنے اور فُٹ پاتھ پر بسیرا کرنے والے اچھے بُرے افراد، اپنے فطری مکالموں کے ذریعے ہی زندگی سے متعلق اپنے نظریات کو پیش کرتے اور اپنے عمل وردِّ عمل کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ ان مکالموں کے ذریعے ہم کرداروں کی نفسیات تک پہنچ سکتے ہیں۔

کرشن چندر نے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ لکھا۔ بسیارنویسی میں ایک برائی یہ ہے کہ مصنف ہمیشہ اعلیٰ معیار قائم نہیں رکھ پاتا۔ اس کے قلم سے شاہ کار تخلیق ہوتے ہیں تو دوسری طرف ایسی تخلیقات بھی سامنے آتی ہیں جنھیں آسانی سے معمولی درجے کی قرار دے کر ردی کی ٹوکری کی نذر کیا جاسکتا ہے۔ کرشن چندر بھی اِس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اُن کے افسانوں میں بہت اعلیٰ، اعلیٰ، اوسط ، معمولی اور تلاش کرنے پر گھٹیا درجے کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ ناقدین نے ان کے فکروفن کے ہر پہلو پر خوب لکھا ہے۔ ان کے موضوعات، کردار، پیش کش اور دیگر فنی خوبیاں اور کم زوریاں برسوں سے زیرِ بحث ہیں لیکن اس امر پر سبھی متفق ہیں کہ کرشن چندر ہماری زبان کے اہم افسانہ نگار ہیں اور ان کے ذکر کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی اور نہ کوئی ایسا انتخاب جس میں اردو کے بہترین افسانے شامل ہوں، کرشن چندر کے افسانے کے بغیر قابلِ اعتبار قرار دیا جاسکتا ہے۔ کرشن چندر افسانوں میں رومان اور حقیقت کا ایک دلکش امتزاج کے علاوہ ایک طرف اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں تو دوسری طرف قدرت کے حسین و دلکش نظاروں اور زندگی کے روشن پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

۱۔ ’افسانہ‘ کسے کہتے ہیں وہ کس طرح دوسری اصناف سے مختلف ہوتا ہے؟

۲۔ افسانے کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟

۳۔ تاریخی لحاظ سے اردو کا پہلا افسانہ نگار کسے مانا جاتا ہے؟ ان کے افسانے کا نام لکھیے؟

۴۔ کس افسانہ نگار سے اردو میں باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز ہوا؟ ان کے پہلے افسانے کا نام لکھیے؟

۵۔ پونے میں رہائش کے دوران تحریر کردہ کرشن چندر کی دو کہانیوں کے نام لکھیے۔

۶۔ 1969ء کرشن چندر کو کس خطاب سے نوازا گیا؟

۷۔ کرشن چندر کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام لکھیے۔

3.6 خلاصہ

اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز معروف و منفرد مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے ’ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ اُن کی کچھ میری زبانی‘ سے ہوتا ہے۔ ان کا دوسرا خاکہ ’ایک وصیت کی تعمیل‘ تھا جو وحید الدین سلیم پانی پتی کی قلمی تصویر پیش کرتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ’چند ہم عصر‘ لکھ کر اس روایت کو مستحکم کیا۔ اردو کے اہم خاکہ نگاروں کے چند نام سعادت

حسن منٹو،محمد طفیل،شاہد احمد دہلوی، ندا فاضلی ، یوسف ناظم ،مجتبیٰ حسین، انور ظہیر خان ہیں۔

مولوی عبدالحق ۲۰/اپریل ۱۸۷۰ءکو ضلع میرٹھ کے ایک قصبے ہاپڑ/ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ ۱۴/اگست ۱۹۱۷ءکو حیدرآباد میں 'دارالترجمہ' کا قیام عمل میں آیا اور مولوی عبدالحق کو اس کا پہلا ناظمِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔۱۹۲۱ء میں انھوں نے اورنگ آباد سے ایک سہ ماہی رسالہ 'اردو' جاری کیا۔اردو رسائل کی تاریخ میں اس رسالے نے اپنا مقام بنایا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں اورنگ آباد کالج کا قیام عمل میں آیا اور مولوی عبدالحق کو کالج کا پہلا پرنسپل بنایا گیا۔۱۹۳۸ء میں وہ انجمن ترقیِ اردو کے دفتر کے ساتھ دہلی منتقل ہوگئے۔مولوی صاحب کے خاکوں کی اہم ترین خوبی اُن کے نثر کی سادگی اور بےتکلفی ہے۔ان کی نثر بلاشبہ دل کش اور دل نشین ہے۔ ہر قسم کے تصنع اور بناوٹ سے پاک، رواں دواں نثر، اپنے قارئین کو باندھے رکھتی ہے۔ان کے خاکوں کی اہم ترین خوبی اُن کے نثر کی سادگی اور بےتکلفی ہے۔

انگریزی میں انشائیہ کو Light Essay کہتے ہیں۔انشائیہ کا بنیادی مقصد سرور وانبساط اور کیف کے لمحے فراہم کرنا ہے۔ ردو کے اولین مضمون نگار مثلاً ماسٹر رام چندر اور سر سید احمد خان وغیرہ اردو کے اولین انشائیہ نگار قرار پائے۔اردو نثر کے رواں دواں کارواں تھا میں سجاد حیدر یلدرم ، مہدی حسن اِفادی، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریاآبادی، خواجہ حسن نظامی، سجاد انصاری، محفوظ علی بدایونی، فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری وغیرہ میں سے ہر ایک نے اردو نثر کی آب یاری کی ۔رشید احمد صدیقی یوپی کے ضلع جون پور کے ایک گاؤں مڑیا میں ۲۴/دسمبر ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔وہ شعروادب کا ذوق رکھتے تھے اور ادب کے اچھے استادوں میں بھی شمار ہوتے تھے۔ان کی زندگی شرافت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا بہترین نمونہ ہے۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے انھیں ۱۹۶۳ء میں 'پدم شری' کا خطاب عطا کیا۔اپنی تصنیف 'غالبؔ کی شخصیت اور شاعری' پر ۱۹۷۱ء میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔رشید احمد صدیقی بنیادی طور پر طنز ومزاح نگار ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔رشید احمد صدیقی نے اکثر مضامین ریڈیو والوں کی فرمائش پر بھی لکھے ہیں۔ چوراسی سال کی عمر میں ۱۵/جنوری ۱۹۷۷ءکو ان کا انتقال ہوا اور وہ اسی شہر میں مدفون ہوئے۔

اردو نثر میں 'افسانہ' ایک دل چسپ اور مقبولِ عام صنف ہے۔بیسویں صدی کے آغاز سے اردو افسانے کا دور شروع ہوتا ہے۔مسائلِ زندگی کی عکاسی کرنے اور اپنے عہد کی سماجی وسیاسی ترجمانی کرنے میں افسانہ نہایت کارآمد صنف ہے۔سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبان کے بعض افسانوں کا ترجمہ پیش کیا تھا۔مصورِ غم اور معروف ناول نگار علامہ راشد الخیری کے افسانے' نصیر اور خدیجہ' کو تاریخی لحاظ سے اولیت حاصل ہے۔لیکن اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز منشی پریم چند کے افسانے 'دنیا کا سب سے نمول رتن' سے ہوتا ہے۔ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنو

میں منعقد ہوئی تھی جس میں ادب کو زندگی سے قریب لانے کے ساتھ اُسے سیاسی انقلاب کے حصول کا آلۂ کار بنایا گیا۔ کرشن چندر بھی ترقی پسند ادیب تھے۔ کرشن چندر کے معاصرین میں سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ کرشن چندر 23 نومبر 1914 کو راجستھان کے شہر بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ 1939 میں آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی ڈائرکٹر احمد شاہ بخاری (پطرس) نے انھیں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں پروگرام اسسٹنٹ کی ملازمت دے دی۔ کرشن چندر کا پہلا ناول " شکست[1943 میں منظر عام پر آیا۔ وہ 8 مارچ 1977ء کو اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے مختصر جوابات دیجیے۔

۱۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیجیے۔

۲۔ اردو کے چند اہم خاکہ نگاروں کا تعارف پیش کیجیے۔

۳۔ رشید احمد صدیقی کی زندگی کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

۴۔ کرشن چندر کی زندگی کے نشیب و فراز بیان کیجیے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات دیجیے۔

۱۔ مولوی عبدالحق کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لیجیے۔

۳۔ اردو کے چند اہم انشائیہ نگاروں سے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

۴۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

3.8 فرہنگ

تخیل	تصور، خیال	مستحکم	پکا، مضبوط
ازسرنو	نئے سرے سے	تشکیل	ساخت، بناوٹ

آبیاری	پانی دینا	غلو	بہت زیادہ مبالغہ
تصنع	بناوٹ، دکھاوا	جدت	نیا پن
دراک	عقل، فہم، پانا	اشتراک	ساجھا، شرکت
معاصرین	معاصر کی جمع، ہم زمانہ لوگ	امتزاج	ملاوٹ، آمیزش

3.9 معاون کتابیں

تاریخ ادب اردو : پروفیسر نورالحسن نقوی

بابائے اردو مولوی عبدالحق : حیات اور علمی خدمات : شہاب الدین ثاقب

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرتبہ عبداللطیف اعظمی

کرشن چندر : شخص اور شاعر مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی

کرشن چندر : شخصیت اور فن : جگدیش چندر وردھان

☆☆☆

اکائی 4 : خواجہ الطاف حسین حالی، میر انیس، نظیر اکبر آبادی

ساخت :

4.1 اغراض ومقاصد
4.2 تمہید
4.3 الطاف حسین حالی
4.3.1 الطاف حسین حالی کے حالات زندگی
4.3.2 الطاف حسین حالی کی نظم نگاری
4.4 میر انیس
4.4.1 اردو مرثیہ
4.4.2 میر انیس کے حالات زندگی
4.4.3 میر انیس کی مرثیہ نگاری
4.5 نظیر اکبر آبادی
4.5.1 نظیر اکبر آبادی کے حالات زندگی
4.5.2 نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاعی
4.6 خلاصہ
4.7 نمونہ امتحانی سوالات
4.8 فرہنگ
4.9 معاون کتابیں

4.1 اغراض ومقاصد

الطاف حسین حالی جدید نظم کے روح رواں اور مقبول ترین شاعر تھے۔انھوں نے جدید نظم کو ایک نئی زندگی بخشی اور اردو شاعری کو حقیقت سے قریب تر کیا۔نظم نگاری کو دروغ گوئی اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنے کی تلقین کی ہے۔وہ فطری شاعری کے علمبردار تھے۔انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے مردہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی شاعرانہ محاسن سے آپ کو واقف کرانے کے لیے یہ اکائی آپ کے نصاب میں شامل کی گئی ہے تا کہ آپ زندگی کی سچائی کو قریب سے سمجھ سکیں۔

میر انیس اردو ادب کی تاریخ میں ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے،جس نے مرثیہ جیسی کم مایہ اور غیر اہم صنف کو اپنی شاعرانہ فن کاری سے بلندی کی اس منزل پر پہنچا دیا جہاں سے مرثیہ بلند ترین اصناف کا ہم پلہ ہو گیا۔

نظیر اکبر آبادی اردو نظم نگاری کے معمار اول شمار کیے جاتے ہیں۔انھوں نے نظم نگاری کو نئے موضوعات سے روشناس کرایا ان کی شاعری عام ڈگر سے ہٹ کر عوامی رنگ میں نظر آتی ہے۔انھوں نے روزمرہ کی عام بول چال کی زبان میں سلیس اور سادے ڈھنگ سے اپنی بات عوام کے دلوں تک پہنچائی ہے۔اس اکائی میں نظیر کی نظم مفلسی ان کی شاعری کی خصوصیات اور انفرادیت سے واقف کرانے کے لیے نصاب میں شامل کی گئی ہے۔

4.2 تمہید

اس اکائی میں خواجہ الطاف حسین حالی کی حیات پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی اور ان کی نظم نگاری کی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کیا جائے گا تا کہ آپ ان کی شعری بصیرت اور جدید نظم نگاری سے بخوبی واقف ہو سکیں۔یہاں آپ کے مطالعہ کے لیے ان کی نظم ''نشاط امید'' دی گئی ہے۔اس اکائی کے مطالعہ سے آپ کو خواجہ الطاف حسین حالی کی زندگی اور شاعری سے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

مرثیہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں بہ یک وقت داخلی وخارجی روابط کی موثر کارفرمائی کے ساتھ حیات انسانی کے گونا گوں پہلوؤں کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے۔مرثیہ نے ہمیں جینے کا شعور وسلیقہ،آداب وضع داری اور علم مجلس کے انداز عطا کیے۔وطن پرستی،حق گوئی،حق پرستی،مردہ ضمیروں کو زندہ کرنا،جاں نثاری کا جذبہ،سماجی زندگی میں ماں،باپ بھائی،بہن،شوہر،بیوی،آقا اور غلام کے رشتے اور مراتب کو جس جامع انداز سے مرثیہ نے پیش کیا ہے وہ کسی اور صنف ادب میں نہیں۔

اس اکائی میں نظیر اکبرآبادی کی حیات پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی اور ان کی نظم نگاری کی انفرادیت، نمایاں خصوصیات کو اجاگر کیا جائے گا۔ یہاں آپ کے مطالعے کے لیے ان کی نظم مفلسی دی جائے گی اور اس کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا۔ اس اکائی کے مطالعے سے آپ کو نظیر اکبرآبادی کی حیات اور ان کی شاعری سے متعلق معلومات حاصل ہو سکے گی۔

4.3 الطاف حسین حالؔی

4.3.1 الطاف حسین حالؔی کے حالات زندگی

الطاف حسین نام حالی تخلص تھا۔ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ۹ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بھائی بہنوں کی سرپرستی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۷ سال کی عمر میں بھائی بہنوں نے شادی کر دی۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دلی کا سفر اختیار کیا اور وہاں نوازش علی سے صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۵۵ء میں دلی سے پھر پانی پت آنا پڑا اور اس طرح سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ لیکن مطالعہ کے شوق کی وجہ سے اکثر کتابیں پڑھ لیں۔ یہ جذبہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ بغیر کسی ترتیب اور نظام کے فلسفہ، حدیث، منطق، تفسیر وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ جاری رہا۔ اسی دوران ایک قلیل تنخواہ پر نوکری بھی مل گئی۔

۱۸۵۷ء کی غدر کے بعد پانی پت سے پھر دلی آئے اور یہاں نواب مصطفی خاں سے ملاقات ہوئی۔ نواب صاحب شعر وشاعری سے اعلیٰ درجہ کا شوق رکھتے تھے۔ تقریباً سات آٹھ برس تک ان سے صحبت رہی جس کا اثر یہ ہوا کہ حالی کی طبیعت بھی شعر وشاعری کی طرف مائل ہوئی۔ چونکہ نواب صاحب بازاری الفاظ اور عامیانہ خیالات سے متنفر تھے جس کا اثر حالی کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مبالغہ آرائی اور دروغ گوئی سے پرہیز کیا ہے۔ وہ حقیقی واقعات کے بیان میں لطف پیدا کر کے سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان کے ذریعہ دلفریب بنانے کو کمال شاعری سمجھتے تھے۔

نواب صاحب کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں نوکری مل گئی جہاں تقریباً چار سال تک کام کیا۔ اس کے بعد کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد اور حالی نے ایک انجمن کی بنیاد رکھی جس میں موضوع پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ انجمن پنجاب کے پہلے موضوعاتی مشاعرے میں ''برسات'' کے عنوان پر مختلف شعرا نے نظمیں سنائیں۔

سرسید احمد کی ترغیب پر حالی نے ''مسدس مدوجزر اسلام'' لکھا جس میں مسلمانوں کی بدحالی اور تنزلی کو بیان کیا

گیا ہے جو بہت مقبول ہوا۔نظم کے علاوہ اردو نثر میں بھی حالی نے چند کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب ''تریاق مسموم'' لکھی جو ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں ہے۔سوانح نگاری میں شیخ سعدی کی حیات پر ''حیات سعدی'' مرزا غالب کی حیات پر ''یادگار غالب اور سرسید کی زندگی پر تقریباً ہزار صفحات پر ''حیات جاوید'' لکھی۔شاعری پر ایک مبسوط مضمون لکھا جو ''مقدمہ شعر و شاعری کے نام سے مشہور ہے۔

حالی نے غزل، نظم، رباعی، قطعہ، نعت، مرثیہ، مثنوی، قصیدہ غرض کہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔حالی ایک سچے محب وطن اور مصلح قوم تھے انھوں نے عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مدرسہ پانی پت میں قائم کیا۔وہ کم عمر لڑکیوں کی شادی کے مخالف تھے اور بیوہ عورتوں کی شادی پر زور دیتے تھے۔انھوں نے قصہ کے پیرائے میں ایک کتاب ''مجالس النساء'' بھی لکھی تھی۔

اردو کا یہ نابغہ روزگار ادیب اور شاعر ۱۹۱۴ء میں ہمیشہ کے لیے تمام اہل وطن کو روتا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مولانا حالی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے کس انجمن کی بنیاد رکھی؟

۳۔ حالی نے عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کہاں مدرسہ قائم کیا؟

۴۔ حالی کا انتقال کب ہوا؟

۵۔ مولانا حالی نے کن کن اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے؟

4.3.2 حالی کی نظم نگاری

اردو ادب کی تاریخ میں الطاف حسین حالی پہلے باضابطہ سوانح نگار، نقاد اور جدید شاعری خصوصاً جدید نظم کے معمار ہیں۔انھوں نے اردو شاعری کو دروغ گوئی اور مبالغہ آرائی سے پاک کر کے حقیقت نگاری سے قریب تر کیا ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں سیدھی سادی اور سچی باتوں کو بیان کرتے تھے ان کا ماننا تھا کہ آج نہیں تو کل سچائی کی قدر ہوگی۔

ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بے قدریوں کے بعد　　　اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

حالی کوقوم کی زبوں حالی کا بہت غم تھاان کا خیال تھا کہ دیگر اسباب کے علاوہ غزل وقصیدہ مسلمانوں کی بربادی کے خاص طور پر ذمہ دار ہیں۔انھیں یقین تھا کہ اردو نظم میں تسلسل کے ساتھ مسلمانوں کو بیدار کرنے کی باتیں تو ہر دل میں اتر جائیں گی۔

کرنل ہالرائڈ کی ایما پر جب انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی گئی تو حالی نے مولانا آزاد کے ساتھ مل کر موضوعاتی مشاعروں کا انعقاد کیا۔جس میں مصرع طرح کے بجائے عنوانات دیے جاتے تھے۔اسی زمانے میں حالی نے برکھارت، مناظرہ رحم وانصاف، نشاط امید اور حب وطن جیسی نظمیں لکھیں۔مولانا حالی کو سرسید سے بہت عقیدت تھی ایسی نظمیں لکھ کر انھوں نے سرسید کی تحریک میں عملی حصہ لیا۔سرسید کی خواہش پر مشہور نظم ''مسدس مدو جزر اسلام'' لکھی۔ یہ مسدس مسلمانوں کی ذہنی، معاشرتی، ثقافتی وسیاسی زبوں حالی کی داستان ہے۔اس میں حالی کا قومی وملی شعور اپنی انتہائی بلندیوں پر ہے۔حالی نے اس مسدس میں قوم کی حالت کی تصویر دردناک انداز میں کھینچی ہے کہ پتھر بھی پگھل جائے۔

مسدس حالی کے علاوہ ''مناجات بیوہ، چپ کی داد ان کی مقبول نظمیں ہیں۔جہاں حالی نے سماج کے اہم مسائل پر خاص توجہ دی۔خصوصیت کے ساتھ عورتوں کی مظلومیت، ذہنی پسماندگی کے اسباب اور ان کی سماجی حیثیت کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔

افسوس دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور وجفا   حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا

گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی   حامی تمہارا تھا نہ یاور کوئی جز ذات خدا

نظموں میں مولانا حالی نے سادہ اور سہل زبان استعمال کی ہے۔اس لیے پڑھنے والا روانی کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے ان کی نظمیں پڑھتا چلا جاتا ہے۔حالی نے اپنی نظموں میں سادہ اور نیچرل خیالات نظم کیے ہیں۔عوام کی عام فہم زبان استعمال کی ہے۔غرض حالی نے ایک ایسے نازک موڑ پر جب ہماری تہذیب، ہماری زبان اور ہمارا ادب سب سخت آزمائش سے دوچار تھے۔ہماری مردہ شاعری میں جان ڈال دی اور جدید شاعری کے روح رواں بن کر سامنے آئے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ انجمن پنجاب کی بنیاد کس کی ایما پر رکھی گئی؟

۲۔ سرسید کی خواہش پر مولانا حالی نے کون سی نظم لکھی؟

۳۔ مسدس حالی کے علاوہ حالی کی مقبول نظمیں کون سی ہیں؟

4.4 میر انیسؔ

4.4.1 اردو مرثیہ

مرثیہ عربی لفظ رثا سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی وصف میت ہے، فیروز الغات عربی میں اس کے معنی مردے پر رونے کے ہیں۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:

''زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مردوں کی تعریف جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے، مرثیہ کہتے ہیں۔''

(مقدمہ شعر وشاعری صفحہ ۲۳۳)

چنانچہ مرثیہ کا اطلاق ایسی ہی نظموں پر ہوتا ہے جن میں رثائی وصف ہو۔ مگر اردو میں لفظ مرثیہ ایک خاص معنی سے وابستہ ہو گیا اور اس سے مراد وہ نظم ہوئی جو سانحۂ کربلا اور محمد وآل محمد سے متعلق ہو۔

مرثیہ کی ابتداعربی زبان سے ہوئی مگر عربی میں مرثیہ گوئی کی دنیا محدود رہی اور دوسرے اصناف سخن کے مقابلے میں اس کو کوئی خاص حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔ وہ صرف اشہار رنج وغم کا ذریعہ ہی رہی۔ مرثیہ گوئی عرب سے جب ایران پہنچی تو یہاں عرب کے مقابلے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

اردو میں دیگر اصناف سخن کی طرح مرثیہ کا رواج بھی دکن سے ہوا۔ دکن مین بہمنی حکومت کے قیام سے ملک و بیرون ملک سے ہر طرح کے اہل کمال جمع ہو گئے تھے اور ایرانیوں کو حکومت مین خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ دکن کی سماجی زندگی میں ایرانیوں نے اپنا گہرا اثر ڈالا اور دیگر مذہبی رسوم کے ساتھ واقعۂ کربلا کی یاد منانے کی بہت سی شکلیں سامنے آئیں اور عزائے حسین کا رواج اس طرح عام ہوا کہ وہ ایک مذہبی فریضہ قرار پایا۔ بہمنی حکومت کے زوال کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا کیونکہ بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ خالص ایرانی اثرات کی ریاست تھیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں :

''محرم کے مراسم کو محمد قلی نے اس خوبی سے رائج کیا کہ شیعوں کے علاوہ سنیوں اور ہندوؤں نے بھی ان ایام کو خاص اہتمام سے منانا شروع کیا اور خاص کر محرم کے ابتدائی دس بارہ روز تو ایسی مصروفیتیں رائج ہو گئیں جن میں سلطنت قطب شاہیہ کا ہر متنفس حصہ لیتا تھا۔''

(حیات اور کارنامے محمد قلی قطب شاہ، صفحہ ۲۰۷)

شمالی ہند میں مرثیہ نگاری کا آغاز روشن علی کے ''عاشور نامہ'' سے ہوتا ہے۔ روشن علی کے بعد مرثیہ نگاری کی تاریخ میں جن لوگوں کا نام آتا ہے ان میں اہم نام فضل علی فضلی کا ہے۔ فضل علی کی ''کربل کتھا'' جو عشرہ محرم میں پڑھنے کے لیے لکھی گئی تھی نثری کتاب ہے لیکن اس میں فضل علی نے اپنے چند مرثیے بھی شامل کیے ہیں۔

اردو مرثیہ جہاں دکن اور دہلی میں پروان چڑھ رہا تھا وہیں اودھ میں بھی اردو مرثیہ کی روایت کو ارتقائی منزلوں کی طرف گامزن کرنے میں مرثیہ نگار شعرا کی اچھی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ اس دور کے اولین شعرا میں میر مستحسن خلیق اور مظفر حسین ضمیر کے نام بہت اہم ہیں۔ جن کے مراثی ادبی محاسن اور شاعرانہ خوبیوں کا نمونہ بن کر سامنے آئے۔ ضمیر اپنے تمام ہم عصر مرثیہ نگاروں میں بہت آگے نظر آتے ہیں۔ اردو مرثیہ کی ہیئت اور اجزائے ترکیبی اسی دور میں متعین ہوئے۔ اس تبدیلی سے مرثیہ اب صرف مذہبی جذبے کے اظہار کا ذریعہ نہیں تھا بلکہ اس کی ادبی حیثیت بھی ہوگئی۔ انیس اور دبیر کے ہاتھوں وہ ادبی منزلت اور فنی مرتبہ کی بلندی پر جا پہنچا۔

بیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے مرثیہ میں بڑی زبردست تبدیلی رونما ہوتی ہے اور مرثیہ نگاری جدید راہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ جس میں سب سے نمایاں نام جوشؔ کا آتا ہے۔ جو مرثیہ کو نیا مزاج، نیا انداز،، لہجہ و تفکر کے ساتھ عطا کرتے ہیں۔ ان کا مرثیہ ''آوازۂ حق'' سامنے آتا ہے۔ جوش کے ساتھ ہی جمیل مظہری اور سید آل رضا کے نام بھی اہمیت حاصل کرتے ہیں۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

۱۔ اردو میں لفظ مرثیہ سے کیا مراد ہے؟
۲۔ مرثیہ گوئی کو کہاں فروغ حاصل ہوا؟
۳۔ فضل علی فضلی کی کتاب کا نام لکھیے۔
۴۔ جوشؔ کے مرثیے کا نام بتائیے۔

4.4.2 میر انیس کے حالاتِ زندگی

میر ببر علی نام، انیس تخلص ۱۸۰۳ عیسوی میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے مورث اعلیٰ میر امامی شاہ جہاں کے عہد سلطنت میں ایران سے ہندوستان آئے اور اپنے علم و فضل کی بدولت سہ ہزاری ذات کے منصب پر فائز ہوئے۔ وہ طبیعت کی موزونی سے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے پوتے میر ضاحک اردو کے صاحب دیوان شاعر ہوئے۔ میر

ضاحک کے فرزند میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے اور جوانی میں اپنے والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے۔ جب نواب آصف الدولہ نے اپنا دارالسلطنت لکھنؤ قرار دیا تو میر حسن لکھنؤ چلے آئے۔ ان کی شہرۂ آفاق مثنوی ''سحر البیان'' ہے۔ اردو میں سیکڑوں مثنویاں کہی گئیں لیکن میر حسن کی ''سحر البیان'' کا جواب نہ ہوسکا۔

میر حسن کے تین بیٹے خلق، خلیق اور مخلوق شاعر تھے۔ خلق اور خلیق صاحب دیوان شاعر تھے۔ میر انیس کے والد میر مستحسن خلیق فیض آباد میں پیدا ہوئے اور آخر عمر میں لکھنؤ چلے آئے۔ میر خلیق مرثیہ گوئی کے میدان میں اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں غزلیں بھی کہی ہیں لیکن شہرت نہ ملی۔ میر خلیق کے تین بیٹے ہوئے انیس، انس، مونس۔ تینوں بیٹے بلند پایہ شاعر اور نام ور مرثیہ گو ہوئے ہیں۔ لیکن میر انیس نے مرثیہ کو اس بلندی پر پہنچا دیا جہاں کسی دوسرے شاعر کی رسائی ممکن نہ ہوئی۔

میر انیس اپنی وضع اور اپنے اوقات کے بڑے پابند تھے۔ شہسواری، شمشیر زنی، بنوٹ وغیرہ میں مشاق تھے۔ ان کا قد میانہ مائل بہ درازی قد تھا۔ ورزش کا شوق تھا جس کی وجہ سے جسم ٹھوس اور اعضا چست و متناسب تھے۔ چھریرا بدن، چوڑا سینہ، صراحی دار گردن، خوبصورت کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں اور گیہواں رنگ تھا۔ مونچھیں ذرا بڑی رکھتے تھے۔

میر انیس نہایت وضع دار آدمی تھے۔ اپنے زمانے کے ذی علم اور ثقہ، شرفا و صلحا کا لباس زیب تن کرتے تھے ہاتھ میں چھڑی اور رومال بھی ضرور ہوتا تھا۔ وہ ایک خوش مزاج آدمی تھے اسی کے نازک مزاج بھی تھے۔ دوسروں کے حفظ مراتب اور تالیف قلب کا حد درجہ کیال رکھتے تھے۔ خودداری اور عزت نفس ان کی سیرت کے بہت نمایاں خصوصیات تھے۔ وہ انسانیت کے ان بے بہا جوہروں کو کسی قیمت پر بیچنے کو تیار نہ تھے ان کی موجودگی میں مصیبتوں اور تکلیفوں کو ہیچ سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں،

بھگو کے کھاتے ہیں پانی میں نان خشک کو وہ　　اس آبرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں

ان کی طبیعت کا فطری میلان انکسار کی طرف تھا اور وہ خاکساری کو انسان کی ایک قابل فخر صفت سمجھتے تھے۔

دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو　　ثمرہ یہ نہال خاکساری کا ہے

مگر ان کی خاکساری میں اعتدال تھا۔ مغروروں اور بد مغزوں سے انکساری کرنا وہ انکساری کی توہین سمجھتے تھے۔

میر انیس صحیح معنوں میں قانع اور متوکل آدمی تھے۔ اپنے اور اپنے عیال کے لیے کسب معاش تو واجب تھا، لیکن حرص و ہوس میں گرفتار نہ تھے۔ وہ اپنے کو بڑے سے بڑے دولت مند سے زیادہ سرمایہ دار سمجھتے تھے۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں،

قناعت و گہر آبرو و دولت دیں　　ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے

میر انیس نے مرثیہ گوئی کی طرح مرثیہ خوانی بھی اپنے والد میر خلیق سے سیکھی تھی۔ تحت اللفظ میں مرثیہ اس طرح پڑھتے تھے کہ تصویریں نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتی۔ میر انیس کے احباب کی کثرت تو نہ تھی لیکن اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ روزانہ نو دس بجے رات تک شعر و ادب پر گفتگو کرتے۔ اچھے اچھے اشعار پڑھے جاتے اور ان پر تبصرہ بھی کیا جاتا۔ میر انیس غیروں کا کلام سناتے انھیں شاہنامہ' فردوسی کے اشعار کثرت سے یاد تھے۔ میر انیس کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا تقریباً دو ہزار کتابیں ان کے پاس تھیں۔

خدائے سخن میر انیس نے ۷۳ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور سرزمین لکھنؤ میں سپرد خاک ہوئے۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

۱۔ میر انیس کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ میر انیس کا کیا نام تھا؟

۳۔ میر انیس کے والد کا کیا نام تھا؟

۴۔ میر انیس کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

4.4.3 میر انیس کی مرثیہ نگاری

انیس کے کلام کی گونا گوں خصوصیات اور فن کارانہ مہارت کو سمجھنے کے لیے ان کے ماحول اور سماجی پس منظر کو بھی دیکھنا بہت ضروری ہے۔ انیس کو پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ کا ماحول ملا، جہاں علوم وفنون کی فضا عام تھی، شعر وشاعری کا چرچا گھر گھر تھا، انیس نے بھی خاندانی روایت کو اپناتے ہوئے شعر وشاعری کی طرف رخ کیا۔ غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، اور واجد علی شاہ کے ادوار کا لکھنؤ جہاں فراغت وخوش حالی کی فراوانی تھی، شاعری کی دنیا غزل و مثنوی کا دور دورہ تھا آتش اور ناسخ کا طوطی بول رہا تھا، شاعری کو صناعی سمجھا گیا اور بندش الفاظ کو نگینے کی طرح جڑنے سے تعبیر کیا گیا۔ ایسے ماحول میں انیس کی شاعری کا خمیر تیار ہوا۔ انیس نے لکھنؤ کی عام فضا سے ہٹ کر اپنی راہ بنائی اور گھر کی فضا سے متاثر ہو کر مرثیہ گوئی کو اپنے اظہار فن کا ذریعہ بنایا۔

مرثیے کا موضوع واقعہ کربلا ہے۔ جو ایک ایسے مجاہدے پر مشتمل ہے جس میں ایک زبردست لشکر چند نفوس سے نبرد آزما ہے، مٹھی بھر برگزیدہ نفوس جو امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ہیں، جنگوں کی تاریخ میں ایک ایسا کارنامہ کر جاتے ہیں کہ دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے انیس کا رزمیہ ہومر، فردوسی اور نظامی سے مختلف ہے۔ امام

حسینؑ کا مختصر ترین لشکر جس میں عورت، مرد، بچے، بوڑھے سب ہی شامل ہیں اور سب بے مثال لوگ اپنے اپنے کردار انفرادیت اور عظمت کے ساتھ ادا کرتے ہیں، یہ انیس کے رزمیے کا کمال ہے۔ دنیا کی کسی جنگ میں اتنے کرداروں کا تنوع یکجا نظر نہیں آتا ہے، ششماہے علی اصغر سے لے کر بوڑھے حبیب ابن مظاہر تک ہر عمر کے افراد موجود ہیں۔ میر انیس نے ان زندہ جاوید کرداروں کو اس انداز سے پیش کیا کہ خود انیس انھیں کے سبب زندۂ جاوید ہو گئے۔

میر انیس کی کردار نگاری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو جہاں صبر و رضا کی مکمل تصویر ملتی ہے:

جب تین پہر میں وہ چمن ہو گیا پامال　　تنہا ہوئے بس پھر تو شہنشاہ خوش اقبال
کھینچے ہوئے تیغیں بڑھے آتے تھے بہر حال　　تھا منتظر حکم خدا فاطمہ کا لال
مانند علی غیظ میں جب آتے تھے مولا
قبضے کی طرف دیکھ کے رہ جاتے تھے مولا

میر انیس کی رزم نگاری میں، چاہے لڑائی کی تیاری کا بیان ہو یا معرکے کا زور و شور، نقاروں کی گونج ہو یا گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں، تلوار کی چمک ہو یا نیزوں کی لچک یا لڑائی کے داؤں پیچ، انیس نے ان سب کے بیان میں ایک ماہر فن کی طرح اپنے جوہر دکھائے ہیں کہ ایسا لگتا ہے جیسے آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں۔ ایک موقع ملاحظہ ہو:

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی تکاں　　چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ، ہاں　　ڈانڈ آئی ڈانڈ پہ تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدھے سے وہ افعی لپٹ گیا

تلوار کی تعریف کا ایک موقع ملاحظہ ہو، کس خوبی، صفائی، برجستگی، شکوہ اور فطری کارکردگی کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کے وسیلے سے زبان کو کن اظہاری امکانات سے روشناس کرایا ہے؛

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے　　تنتی تھی بس تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے　　دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانیے ملا تھا مزہ کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

میر انیس کے رزمیہ عناصر کے بیان میں جو تصویریں آنکھوں کے سامنے کھنچتی ہیں، وہ حقیقت نگاری کا نمونہ معلوم ہوتی ہیں۔ان کی یہ مرقع نگاری ان کے کلام میں منظر نگاری کے بہترین نمونے پیش کرتی ہے۔اور یہی مرقع نگاری جب داخلی بیان کے ساتھ رونما ہوتی ہے تو جذبات نگاری اور کردار نگاری کے مکمل نقشے نگاہوں کے سامنے پھر جاتے ہیں،جس کی مثالیں اردو مرثیوں میں انیس سے پہلے کم یاب ہیں۔انیس کو منظر نگاری اور جذبات فطرت کی ترجمانی پر عبور حاصل ہے۔یہ بند ملاحظہ ہو:

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار　　　پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار　　　بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

انیس کے یہاں مناظر کی پیش کش میں تفکر، تخیل اور حسن بیان کو کچھ اس طرح سے جگہ ملی کہ جذبے کی شدت کے سچے نمونے فکر کی گہرائی اور اظہار کی رعنائی کے ساتھ سامنے آئے۔منظر کشی اور جذبات نگاری کا ایک موقع ملاحظہ ہو جب امام حسینؑ گھر چھوڑ کر نانا کے مدینے کو الوداع کہہ کر روانہ ہوتے ہیں تو اس سفر میں ان کی چھوٹی بیٹی صغریٰ اپنی بیماری کے سبب باپ کے ساتھ نہیں جا پاتیں، روانگی کے وقت کا منظر کس نیچرل انداز میں پیش کیا ہے۔

سب بیبیاں رونے لگیں سن سن کے یہ تقریر　　　چھاتی سے لگا کر اسے کہنے لگے شبیر
لو صبر کرو، کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر　　　منہ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بے کس و دلگیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے، پہ آنسو نکل آئے

انیس کا کلام فصاحت و بلاغت کی بہترین مثال ہے ان کے کلام سے کوئی لفظ نکال کر اس جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ دینا آسان نہیں ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا　　　تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

یہاں انیس نے اوس کا لفظ استعمال کیا ہے اگر کوئی چاہے کہ یہاں شبنم کا لفظ استعمال کریں تو ممکن نہیں ہے۔یا میدان کربلا

میں جب پہلوان بصرہ امام حسینؑ سے سوال کرتا ہے کہ آپ کون ہیں انیس اس جواب کو یوں ادا کرواتے ہیں:

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

یہ جذبۂ انکساری کی بہترین مثال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انیس نے اپنے مراثی سے اردو زبان کو وسعتیں اور توانائیاں عطا کی ہیں، اور مرثیہ جیسی صنف کو جدت وندرت سے ایسی وسعت سے سرفراز کیا کہ وہ اعلیٰ درجے کا فن پارہ بن گیا۔ ان کے مرثیہ میں اردو شعری اصناف کی تمام عمدہ صفات اس طرح یکجا ہوگئیں کہ مرثیے انتہائی کمال پر پہنچ گئے اور انیس کے بعد مرثیے کے میدان میں کوئی بھی شاعر اس منزل کو نہ پہنچ سکا۔

4.5 نظیر اکبر آبادی

4.5.1 نظیر اکبر آبادی کے حالاتِ زندگی

شیخ ولی محمد نام نظیر تخلص ۱۷۳۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ بارہ بھائی بہنوں میں تنہا باحیات رہے۔ بچپن میں ہی ماں کے ساتھ دہلی سے آگرہ منتقل ہوئے اور تاج گنج میں مقیم ہوئے۔ عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں حاصل کی۔ بچپن ہی سے شعر وشاعری سے فطری رجحان تھا اس لیے شاعری شروع کردی۔ نظیر قناعت پسند انسان تھے ساری زندگی بچوں کو تعلیم میں گزاردی۔ کسی حکمران کی دعوت کبھی قبول نہیں کی۔ وہ مشغولی سے بہتر معزولی کو سمجھتے تھے اس لیے درباری شاعری سے پرہیز کیا اور عوامی شاعر کہلائے۔

نظیر اردو ادب کا وہ عظیم شاعر ہے جس کا نام اردو شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ نظیر کا دور عیش وتفنن کا دور تھا جس میں شاعری محبوب کی چوٹی، اس کے رخسار اور گل وبلبل کے نغموں تک محدود تھی۔ غزل میں عشقیہ مضامین کی بہتات تھی۔ نظیر اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے محمد حسین آزاد اور حالی سے پہلے جدید نظم کی کامیاب تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ انھوں نے روزمرہ، مناظر فطرت اور عوام کی زندگی کی فطری عکاسی کی ہے۔ نظیر نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جس میں ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے حقائق کو نہایت خوش اسلوبی سے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں میں پند ونصائح بھی ہیں اور حقائق ومعارف بھی۔ تقریباً دوصدیاں گزر جانے کے باوجود بھی ان کی شاعری دور جدید کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ آج بھی مقبول خاص وعام ہے۔

نظیر صوفی منش شاعر تھے۔ وہ اپنے وطن سے بے انتہا محبت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں

ہندوستان کے تہواروں، موسموں، میلوں ٹھیلوں، تہذیب وتمدن، اخلاقی، سماجی اور اقتصادی ہر طرح کے پہلو نظر آتے ہیں۔نظیر کا مجموعہ کلام'' کلیات نظیر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔عوام کے دلوں پر حکومت کرنے والا شاعر آخری عمر میں فالج کی زد میں آ گیا اور اسی حالت میں سن ۱۸۳۰ء میں وفات پائی۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ نظیر کا کیا نام تھا؟ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ نظیر کے مجموعہ کلام کا کیا نام ہے؟

۳۔ نظیر کو عوامی شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟

4.5.2 نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری

نظیر اکبرآبادی اردو نظم کے معمار اول تسلیم کیے جاتے ہیں۔انھوں نے شعروادب کو عوام سے قریب لانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔چونکہ عوام الناس کے دل کی آواز کو نظیر اپنی نظموں میں پیش کرتے تھے اسی لیے عہد جدید کے تمام نقادوں نے انھیں عوامی شاعر کہا ہے۔نظیر خود اپنے آپ میں ایک دبستان تھے وہ اردو کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر شاعری میں عوامی رنگ اور نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کے مسائل ڈھونڈنے میں دلچسپی لی ہے۔یہی ان کی انفرادیت ہے۔

نظیر اکبرآبادی دلی میں پیدا ہوئے لیکن آگرہ کو ہی اپنا وطن قرار دیا اور ہر جگہ فخر کے ساتھ اسے نظم کیا ہے۔

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

وہ اپنے ملک ہندوستان سے بے پناہ محبت کرتے تھے یہاں کے جانوروں، پرندوں، موسموں پر بڑے والہانہ انداز میں نظمیں لکھی ہیں۔

نظیر کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔جس میں پندونصائح اور اخلاقی تعلیم کے بے شمار مواقع نکل آتے ہیں۔خدا کی پہچان، اہل دنیا، آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، کلجگ، آدمی نامہ، روٹیاں دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے وغیرہ نظمیں اس کی گواہ ہیں۔نظم مفلسی نظیر اکبرآبادی کی بہترین نظم ہے اس نظم کے ذریعہ غربت اور تنگ دستی کا نقشہ بہترین پیرائے میں کھینچا ہے۔

کیسا ہی آدمی ہوٗ پر افلاس کے طفیل کوئی گدھا کہے اسے' ٹھہراوے کوئی بیل
کپڑے پھٹے تمام' بڑھے بال پھیل پھیل منہ خشک' دانت زرد' بدن پر جما ہے میل
سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

نظیر کی نمائندہ نظموں میں آدمی نامہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔اس نظم میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس نظم میں انسان کی مختلف خصلتوں کا ذکر کیا ہے۔

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیرا کبرآبادی کی نظموں میں انسان دوستی کا جذبہ نمایاں ہے۔وہ پورے احساس کے ساتھ انسان کی قدر اور اس کی زندگی کی حفاظت کے خیالات کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔وہ صرف نادار و مفلس انسان سے ہی محبت نہیں کرتے بلکہ ان کی شاعری میں ہر انسان سے محبت کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے۔ان کی نظم روٹی جو ہر زمانے میں انسانی مسئلہ تھی۔ ہر ایک آدمی روٹی کے لیے خاک چھانتا ہے۔بھوکا ہو تو ہر شئی اسے روٹی روٹی نظر آتی ہے اگر چہ چاند سورج ہی کیوں نہ ہو۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے یہ مہرو ماہ حق نے بنایا ہے کس لیے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے ہم تو نہ چاند سمجھے نہ سورج ہی جانتے
بابا ہمیں تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں

نظیرا کبرآبادی کی نظمیں انسان دوستی کی ایک مثال ہیں۔وہ ہندو مسلمان سب سے یکساں محبت کرتے تھے۔ ہندوستان کے کسی زبان کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کی شاعری سے ایکتا، بھائی چارہ،قومی یکجہتی کی ایسی تعلیم ملتی ہو جیسی نظیر کی شاعری سے ملتی ہے۔ان کی نظمیں ملکی سرحدوں تک محدود نہیں بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کی خوشیوں اور دکھ درد سے مملو نظر آتی ہین۔جس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ عالم امسانیت کے شاعر ہیں۔نظیر نے بعض چھوٹے چھوٹے موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔چھوٹے موضوعات پر نظم وہی لکھ سکتا ہے جس کا دل ہمدردی سے لبریز ہو،مشاہدہ قوی ہو اور عام زندگی کا قوی احساس ہو۔ نظیر کی نظموں میں ملک کی زبوں حالی، معاشی پریشانیاں اور ملکی مسائل کی بھر پور عکاسی نظر آتی ہے۔ جیسے

بنجارہ نامہ، آدمی نامہ، مفلسی وغیرہ۔ عام طور سے وہ سیدھی باتیں سیدھے سادے انداز میں بیان کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں علامتی انداز بھی نظر آتا ہے۔ بنجارہ نامہ سے ایک بند ملاحظہ ہو۔

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی　　اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آوے گی
یہ کھیپ جو تونے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی　　دھی پوت، جنوائی، بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

نظیر اپنی نظموں میں روزمرہ کی عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں ان میں کہیں کہیں کھڑی بولی اور برج بھاشا بھی گھل مل جاتی ہے۔ عربی، فارسی، اودھی، پنجابی زبانوں سے بھی نظیر کو اچھی واقفیت تھی اور زبانوں کے الفاظ بھی بہ آسانی استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور استعمال پر نظیر کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ نظیر کو پیکر تراشی پر مہارت حاصل ہے وہ جس حالت کو بھی بیان کرتے ہیں اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ ان کی ہر نظم ایک مرقع ہے اور ان کا کلیات ایک البم ہے۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

۱۔　نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں کون سا جذبہ نمایاں ہے؟

۲۔　عہد جدید کے تمام نقادوں نے نظیر کو کیا نام دیا ہے؟

4.6　خلاصہ

الطاف حسین نام حالی تخلص تھا۔ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ۹ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انھوں نے مطالعہ کے شوق کی وجہ سے اکثر کتابیں پڑھ لیں۔ یہ جذبہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ بغیر کسی ترتیب اور نظام کے فلسفہ، حدیث، منطق، تفسیر وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ جاری رہا۔ اسی دوران ایک قلیل تنخواہ پر نوکری بھی مل گئی۔ ۱۸۵۷ء کی غدر کے بعد پانی پت سے پھر دلی آئے اور یہاں نواب مصطفی خاں سے ملاقات ہوئی۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں نوکری مل گئی جہاں تقریباً چار سال تک کام کیا۔ اس کے بعد کرنل ہالرائیڈ ڈاکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد اور حالی نے ایک انجمن کی بنیاد رکھی جس میں موضوع پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ سرسید احمد کی ترغیب پر حالی نے ''مسدس مدوجزر اسلام'' لکھا جس میں مسلمانوں کی بدحالی اور

تنزلی کو بیان کیا گیا ہے جو بہت مقبول ہوا۔مسدس حالی کے علاوہ ''مناجات بیوہ، چپ کی داد ان کی مقبول نظمیں ہیں۔ جہاں حالی نے سماج کے اہم مسائل پر خاص توجہ دی۔خصوصیت کے ساتھ عورتوں کی مظلومیت، ذہنی پسماندگی کے اسباب اور ان کی سماجی حیثیت کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔

اردو میں لفظ مرثیہ ایک خاص معنی سے وابستہ ہو گیا اور اس سے مراد وہ نظم ہوئی جو سانحۂ کربلا اور محمد و آل محمد سے متعلق ہو۔اردو میں دیگر اصناف سخن کی طرح مرثیہ کا رواج بھی دکن سے ہوا۔شمالی ہند میں مرثیہ نگاری کا آغاز روشن علی کے ''عاشور نامہ'' سے ہوتا ہے۔اردو مرثیہ جہاں دکن اور دہلی میں پروان چڑھ رہا تھا وہیں اودھ میں بھی اردو مرثیہ کی روایت کو ارتقائی منزلوں کی طرف گامزن کرنے میں مرثیہ نگار شعرا کی اچھی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔میر ببر علی نام، انیس تخلص ۱۸۰۳ عیسوی میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔انھوں نے مرثیہ گوئی کی طرح مرثیہ خوانی بھی اپنے والد میر خلیق سے سیکھی تھی۔حقیقت یہ ہے کہ انیس نے اپنے مراثی سے اردو زبان کو وسعتیں اور توانائیاں عطا کی ہیں، اور مرثیہ جیسی صنف کو جدت و ندرت سے ایسی وسعت سے سرفراز کیا کہ وہ اعلیٰ درجے کا فن پارہ بن گیا۔

شیخ ولی محمد نام نظیر تخلص ۱۷۳۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔نظیر قناعت پسند انسان تھے ساری زندگی بچوں کو تعلیم میں گزار دی۔کسی حکمران کی دعوت کبھی قبول نہیں کی۔وہ مشغولی سے بہتر معزولی کو سمجھتے تھے اس لیے درباری شاعری سے پرہیز کیا اور عوامی شاعر کہلائے۔وہ اپنے وطن سے بے انتہا محبت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں ہندوستان کے تہواروں، موسموں، میلوں ٹھیلوں، تہذیب و تمدن، اخلاقی، سماجی اور اقتصادی ہر طرح کے پہلو نظر آتے ہیں۔

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ حالی کی نظم نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

۲۔ میر انیس کے حالات زندگی پر نوٹ لکیے۔

۳۔ نظیر نے اپنی نظم مفلسی کے ذریعے لوگوں کی مفلسی اور تنگ دستی کا نقشہ کس طرح کھینچا ہے؟

(ب) مندرجہ ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ حالی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی نظم نگاری پر نوٹ لکھیے۔

۲۔ نظیر کے کلام کے محاسن پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ میر انیس کی مرثیہ نگاری کا جائزہ پیش کیجیے۔

4.8 فرہنگ

دل سوز	دل جلانے والا	بے ہراس	بے خوف
کارساز	کام بنانے والا	خاطر	دل، لیے
سپر	ڈھال	آس	امید
شفیق	مہربان	مہجور	فراق زدہ
کوہ	پہاڑ	چاہ	کواں، چاہت
ایام	یوم کی جمع دن	دل آرا	دل کو آراستہ کرنے والا
عسرت	تنگی، مفلسی	مدام	ہمیشہ
قناعت	جو مل جائے اس پر راضی رہنا	یاس	ناامیدی

بسر کرنا	گزارنا	صفدر	لشکر کی صف کو پھاڑنے والا
مہم	اہم کام، جنگ	سرور	سردار، بادشاہ
سر کرنا	فتح کرنا	خوش لحنی	اچھی آواز
شہ دیں	دین کے بادشاہ (حسینؑ)	نخل	درخت، کھجور کا درخت
رخ	چہرہ	وجد	خوشی سے جھومنا
ازل	آغاز، روز اول	واری	قربان ہونا
بضاعت	دولت، سامان، حصہ	باری	پیدا کرنے والا، خالق
بنی	اولاد، نسل	طاعت	بندگی، فرماں برداری
صابر	صبر کرنے والا	غبار	دھول، گرد
شاکر	شکر کرنے والا	حجازی	حجاز کا رہنے والا (حسینؑ)
برار	نیکوکار، پرہیزگار	غازی	بہادر، دشمن خدا ورسول سے جنگ کرنے والا
مرحلہ	منزل، درجہ مرتبہ	فراغت	فرصت، اطمینان
خلقت	مخلوق		

مسلح	ہتھیار بند، ہتھیار لگائے ہوئے
سبکسار	بوجھ ہلکا ہونا، ذمہ داری سے فراغت پانا
وظائف	وظیفہ کی جمع، نماز کے بعد دعا وغیرہ پڑھنا

4.9 معاون کتابیں

مقدمہ شعر و شاعری	مولانا حالی	موازنۂ انیس و دبیر	شبلی نعمانی
اردو مرثیے کا ارتقا	مسیح الزماں	اردو مرثیے کے اولین نقوش	ڈاکٹر جعفر رضا
نیسیات	سید مسعود حسن رضوی ادیب		
مرثیہ شناسی	ڈاکٹر سید علی حیدر		

☆☆☆

اکائی: 5۔ اکبرالہٰ آبادی، چکبست، جوش ملیح آبادی

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد
5.2 تمہید
5.3 اکبرالہٰ آبادی، چکبست اور جوش کا عہد
5.4 اکبرالہ آبادی
5.4.1 اکبرالہ آبادی کی حیات وشخصیت
5.4.2 اکبرالہ آبادی کی ادبی خدمات
5.5 چکبست
5.5.1 چکبست کے حالات زندگی
5.5.2 چکبست کی نظم نگاری
5.6 جوش ملیح آبادی
5.6.1 جوش ملیح آبادی کے حالات زندگی
5.6.2 جوش ملیح آبادی کی نظم نگاری
5.7 خلاصہ
5.8 نمونۂ امتحانی سوالات
5.9 فرہنگ
5.10 معاون کتابیں

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں اکبرالہٰ آبادی کے عہد پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی اور اُن کی حیات وشخصیت کو مفصل طور پر پیش کیا جائے گا کیونکہ کسی کی فنکار کی حیات وشخصیت کی جھلکیاں اُس کے ادب میں کہیں نہ کہیں نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اکبرالہٰ آبادی کی ادبی خدمات کے تحت اُن کی شاعری، مضامین وخطوط پر سیر حاصل بحث کی جائے گی۔ چونکہ اکبرالہٰ آبادی بنیادی طور پر شاعر تھے اسلئے بالخصوص اُن کی شاعری پر توجہ واہمیت دی جاتی ہے جبکہ اُنہوں نے نثر میں خطوط، تراجم اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ لہٰذا اُنکی ادبی خدمات کو پیش کرتے ہوئے ان کے مذکورہ شعری ونثری کارناموں سے آپ کو واقفیت بخشی جائے گی۔ اکبرالہٰ آبادی کی طنزیہ وظریفانہ شاعری کی خصوصیات موضوعات، دیگر اصناف میں اُن کی ادبی وتصنیفی خدمات سے واقف کرانے کے لئے اس کائی کو آپ کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ جو آپ کی معلومات میں اضافہ کرے گی۔

اردو ادب کے اُن چند منتخب شعراء میں جنھوں نے اردو شاعری کو آورد وتصنع کی قید سے نکال کر ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیا، پنڈت برج نرائن چکبست کا نام خاص عزت واحترام کا مستحق ہے۔ علاّمہ اقبالؔ بیسویں صدی کے سب سے ممتاز شاعر ہیں۔ اقبالؔ کے بعد اردو شاعری کے جو دو بڑے نام ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں زمانی ترتیب کے اعتبار سے جوشؔ کو دوسرا بڑا شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے انھوں نے نظم اور مسلسل غزل دونوں میں ایسی رومانی شاعری کی ہے جسے اردو کی اعلیٰ ترین رومانی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ جوشؔ کو شاعرِ انقلاب بھی کہا جاتا ہے۔

5.2 تمہید

اکبرالہٰ آبادی اپنی منفرد طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے باعث ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کے طنزومزاح کا مرکزی نشانہ ہندوستانیوں کا انگریزی اور جدید تہذیب کی کورانہ تقلید، انگریزی حکومت کی پالیسیوں اور جدید تعلیم وتہذیب تھا۔ اور اس پر انہوں نے طنزیہ ومزاحیہ اشعار کے ذریعے تنقید ونصیحت کی۔ اُن کے اسی اندازِ فکر نے انہیں پیامی شاعر کا درجہ عطا کیا۔ اور اپنے عہد کو طنزومزاح کے مخصوص آہنگ و لہجے میں پیش کرنے کے باعث انہیں لسان العصر کے خطاب سے نوازا گیا۔

اردو ادب کی تاریخ میں مسلمانوں کے دوش بدوش صدہا نام ہندوؤں کے ملیں گے، جنھوں نے اپنی گراں قدر کوششوں سے ادب کی مختلف اصناف کو مالا مال کیا۔ اس فہرست میں ایک نام برجؔ نرائن چکبست جیسے ادیب، شاعر اور صاحبِ ذوق کا بھی ہے۔

جوشؔ کی شاعری کے کئی پہلو ہیں وہ شاعر فطرت ہیں، ان کی بہت سی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ

شاعرِ رومان بھی تھے۔ جنگِ آزادی کے زمانے کی ان کی وطنی اور انقلابی شاعری کے تناظر میں ہندوستانی عوام نے انھیں ''شاعرِ انقلاب'' کے خطاب سے نوازا۔

5.3 اکبرالہٰ آبادی، چکبستؔ اور جوشؔ کا عہد

یہ مسلم حقیقت ہے کہ حقیقت پسند فنکار اپنے فن پارے میں اپنے عہد، اپنی ذاتی، انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی حالات ومسائل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور اکبر کی تخلیقات بھی اسی صداقت پر پوری اُترتی ہے۔ اکبر کا عہد انیسویں صدی کا عہد تھا۔ اور ہندوستان کی تاریخ میں یہ صدی ناقابل فراموش تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ اس صدی کا اہم سانحہ ہندوستانیوں کی پہلی جنگ آزادی یعنی ۱۸۵۷ء کی بغاوت والمیہ۔ جس نے ہندوستانیوں زندگی کو سیاسی، معاشی، مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی ہر سطح پر منقلب کیا۔ حالانکہ قبل اس کے ہندوستان ان تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ لیکن اس عظیم سانحہ کے بعد مسلّط قوم کے جبر واستبداد نے زندگی کو یکسر بدل دیا۔ خوشحالی واختیار کی جگہ غلامی براجمان ہوگئی اور سیاسی، ذہنی اور تہذیبی غلامی ہندوستانیوں کا مقدر بن گئی۔ عظیم الشان اور طویل عرصہ قائم رہنے والی مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ جاگیر دارانہ نظام ختم کردیا گیا۔ انگریز اقتدار پر قابض ہوگئے اور خصوصاً مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیمی، سماجی اور پیشہ وارانہ حیثیت ومنصب سے محروم کردیا گیا۔ ان کی زندگی تنگ کردی گئی۔ کئی لوگوں کو کالے پانی اور پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ بے بسی کی انتہا اور بے سروسامانی کے انہیں بھیک مانگنے پر مجبور کردیا۔ مزید ستم ڈھاتے ہوئے انگریزی حکومت نے مذہب میں مداخلت شروع کردی۔ اور سازش کے تحت اپنے مذہب عیسائیت کی تبلیغ شروع کی۔ نتیجتاً انگریزی حکومت میں ملازمت کرنے والے مسلمان انگریزوں کی تہذیب کا اتباع کرنے لگے۔ اور اپنی اسلامی تہذیب کو فراموش کر بیٹھے۔ اور اسطرح تقلید وغلامی کے رویے میں مسلمانوں کی اپنی سماجی، مذہبی اور تہذیبی شناخت خطرے میں پڑ گئی۔ مسلمانوں کو اُن کے بیش بہا اور عظیم ورثۂ حیات سے محروم کرنے والے انگریزوں سے شدید نفرت کو اکبرالہ آبادی نے اپنی طنز کے نشتر سے بھرپور شاعری کے ذریعے عیاں کرتے ہوئے اپنی قوم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔

چکبستؔ نے اپنی شاعری میں قومیت اور وطن پرستی کے جذبات پر وکرار دو شاعری کا رُخ حبِّ وطن اور قوم پرستی کی طرف پھیر دیا اور جوشؔ نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی زبردست آواز بلند کی اور انقلاب کے ایسے نعرے لگائے کہ ان کا یہ شعر عوام وخواص سب کی زبان پر تھا۔

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب وانقلاب وانقلاب

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ اقتدار پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو کن حقوق سے محروم کیا؟

۲۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد سندوستانیوں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

۳۔ اکبرالہ آبادی نے اپنی طنز کے نشتر سے بھرپور شاعری کے کس کام کا بیڑا اُٹھایا؟

5.4 اکبرالہٰ آبادی

5.4.1 اکبرالہٰ آبادی کی حیات وشخصیت

اکبر کے اسلاف نیشاپور سے ہندوستان آئے تھے۔ انگریزوں کی جنگ پلاسی میں اکبر کے پردادا سیّد محمد زماں نے انگریزی فوج میں شامل ہوکر دلیری وشجاعت دکھائی تھی جس سے متاثر ہوکر انھیں بنگال کا صوبیدار بنایا گیا تھا۔ سید محمد زماں کے دو بیٹے تھے۔ سید فضل محمد اور سید فضل الدین احمد۔ سید افضل محمد کے تین بیٹے تھے۔ دراصل علی وارث علی اور تفضّل حسین۔ اکبرؔ الہٰ آبادی تفضّل حسین کے بیٹے تھے۔ چھوٹے صاحبزادے کا نام اکبر حسن تھا۔ اکبر کے والد تفضّل حسین رضوی نائب تحصیلدار تھے۔ اکبر کی والدہ بھی نیک، شریف النفس پرہیزگار بی بی تھیں۔

اکبر کی جائے پیدائش داؤ دنگر ضلع شاہ آباد صوبہ بہار ہے جہاں ۱۶/نومبر ۱۸۴۶ء کو اکبر کی ولادت ہوئی۔ اکبر کا بچپن داؤ دنگر ضلع شاہ آباد صوبہ بہار میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم مشرقی طرز پر گھر میں دی گئی۔ آغاز میں مذہبی تعلیم دی گئی اور آٹھ برس کی عمر میں وہ مکتب میں جانے لگے۔ بعد میں اسکولی تعلیم کے لئے ۱۸۵۶ء میں جمنا مشن اسکول داخل کئے گئے۔ اس سے قبل گھر پر انہوں نے عربی، فارسی، اُردو، ریاضی اور انگریزی سے واقفیت حاصل کرلی خصوصاً انگریزی اور ریاضی میں اُنہیں مہارت حاصل ہوگی۔ ابھی انہوں نے اسکول میں پڑھنا شروع کیا تھا کہ ایک سال بعد ۵۷ کی جنگِ آزادی (غدر) کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوگئی اور اس خون آشام جنگ اور کربناک نتائج نے ہندوستانیوں کی زندگی اجیرن کردی۔ ایسے میں اکبر کو اپنی تعلیم چھوڑنی پڑی۔ لیکن گھر میں انہوں نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ اور اس دوران انہوں نے ادب، فلسفہ اور مذہب کا بخوبی مطالعہ کیا۔ تباہ کن اور ناکام بغاوت سے ہندوستانیوں کو سخت مالی مشکلات ومسائل سے دوچار کیا۔ چنانچہ اکبر کا خاندان بھی ان مالی پریشانیوں کا شکار رہا، جس کے تحت اکبر کو تلاش وحصول معاش کی فکر ہوئی اور یوں اُن کی ملازمت کا آغاز ہوا۔ اور سب سے پہلے انہوں نے عرض نویس کی حیثیت سے ملازمت کی۔ بعد ازاں دیگر ملازمتیں کی جنھیں وکیل، مجسٹریٹ، نائب تحصیلدار وغیرہ شامل ہیں۔ قانون سے انھیں ازحد دلچسپی تھی۔ اور ۱۸۷۳ء میں وکالت ہائی

کورٹ کا امتحان پاس کیا ۱۸۸۱ء میں منصف اور ۱۸۸۸ء میں سب جج بنے۔ ۱۸۹۴ء میں بحیثیت سیشن جج انکا تقرر ہوا۔ اُنکی عدالتی خدمات کے صلے میں انھیں برطانوی حکومت نے ۱۸۹۸ء میں خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ اُن کی قابلیت و ذہانت کی بدولت ملازمت میں درجہ بہ درجہ ترقی دی گئی۔ اور آخر میں ہائی کورٹ کے جج کے منصب پر بھی اُنہیں فائز کیا گیا۔لیکن ناسازی طبیعت کی بناء پر انہوں نے ۱۹۰۳ء میں قبل از وقت پنشن لے لی۔

اکبر کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کی پہلی شادی کم عمری میں ہی ہوگئی تھی۔ اور بیوی اُن سے عمر بڑی تھی اور انھیں پسند نہ تھی۔ اس لیے اُن میں اختلافات تھے۔ اُس بیوی سے اکبر کو ۲ بیٹے تھے۔ عباد حسین اور نذیر حسین۔ لیکن اکبر نے اپنے بچوں پر خاص توجہ نہ دی۔ بعد میں اکبر نے دوسری شادی ایک طوائف سے کی۔ چند روز بعد اس کی وفات ہوگئی۔ تیسری شادی فاطمہ صغریٰ نامی خوبصورت اور خوش سیرت خاتون سے ہوئی۔ جن سے اکبر کو دو بیٹے اور بیٹی تھی۔ عشرت حسین انکا بڑا بیٹا تھا، جسے حصول اعلیٰ تعلیم انگلستان بھیجا تھا، جہاں رہتے ہوئے وہ اپنی تہذیب و مذہب سے بے نیاز ہونے لگے تھے۔ اکبر نے اُن کی مذمت و نصیحت اور اصلاح کے لئے اشعار و نظمیں کہی۔ بیٹے کی کجرویوں نے انھیں ملول و مایوس کر دیا۔ اس پر دوسرا صدمہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۰ء میں اُنکی عزیز بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کے بعد چھوٹے بیٹے ہاشم کی بھی وفات ہوگئی۔ زندگی میں ان سلسلے وار دکھوں اور مصائب نے انھیں شکستہ دل کر دیا۔ اور ۹ رستمبر ۱۹۲۱ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

شخصی اعتبار سے اکبر متفاد رویوں کے حامل تھے۔ لیکن اُنکی شخصیت کا متاثر پہلو ان کا پابندِ مذہب ہونا تھا۔ مغربی تہذیب کے سحر میں قوم کا مسحور ہوکر دین سے بیگانگی ان کے لئے بہت افسوسناک بات تھی۔ اسی لئے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا اور اصلاح و رہبری کے انداز میں انہوں نے اعتدال روی سے کام لیا، حالانکہ دیگر باتوں و معاملات میں سخت مزاج اور غصہ ور تھے۔ اکبر کے مذہبی روّیے کا ترجمان ڈاکٹر صغریٰ مہدی کی زبانی ملاحظہ ہو :

> ''مولانا عبدالماجد دریا آبادی اپنی نوجوانی کے زمانے میں جدید تعلیم و فلسفے کے اثر سے مذہب سے بیگانہ ہوگئے تھے۔ ان کی مذہب سے بیگانگی کا اکبر کو بہت رنج تھا مگر وہ اس پر بجائے اس کے کہ اُن پر رنج و غصے کا اظہار کرتے، لعنت و ملامت کرتے، موقع موقع سے ان کو مذہب کی طرف متوجہ کرتے اور اس کی خوبیاں بتاتے رہتے۔''

مزاج کا تضاد ازدواجی اور سماجی زندگی میں بھی تھا۔ ایک طرف اُنکی پہلی بیوی اور بچے اُنکے عتاب و غصے اور بیزارگی کا شکار تھے، تو وہیں دوسری طرف اکبر اپنے دوستوں سے الفت وخلوص کا رویہ رکھتے تھے۔ مزاج کا یہ روپ اُن کے کلام میں بھی نمایاں رہا۔ کبھی اپنے اشعار میں اہلِ اقتدار، سیاسی رہنماؤں اور حکومت، مغربی تہذیب اور اُسکے مقلدین پر طنز کرتے اور بعد میں اُنکے ردِعمل سے بھی خوفزدہ رہے۔ ساتھ ہی حکمراں قوم سے اپنی نفرت کا اظہار اور اپنے دین و تہذیب کی پاسداری کا بھی عزم کرتے۔ جیسے کہ اس شعر میں یوں فرماتے ہیں :

تائید وضع ملت دین کی کروں گا میں
اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر

اکبر ایک سادہ مزاج، عزت نفس کا احساس رکھنے والی شخصیت کا نام ہے۔ اپنے ماتحت افراد اور ملازموں سے اُن کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ اکبر اپنے عہد کی آزادیِ نسواں کی تحریک کے سخت خلاف تھے جس کے زیرِ اثر عورت بے باک و بے پردگی اختیار کر چکی تھی۔ جب کہ اکبر عورت کو مشرقیت سے آراستہ اور مذہب و پردے کی پابند دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنی اس فکر کو انہوں نے اپنے اشعار میں پیش کیا۔ ملاحظہ ہو :

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

اکبر کی شخصیت وسیرت کا روشن پہلو اُنکی منکسر المزاجی، خندہ روئی اور دریا دلی تھا۔ وہ دوسروں کو خوب تر قابل تحسین اور خود کو معمولی سمجھتے تھے۔ دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنا اور خود کو بدتر سمجھنا ایک وسیع القلب انسان ہی کر سکتا ہے۔ اور اُن کے اس مزاج کا ثبوت اُنکے بیشتر خطوط سے بخوبی ملتا ہے جو اُنہوں نے اپنے عزیز و اقارب کو لکھے ۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ اکبرالہٰ آبادی کی سن پیدائش اور جائے پیدائش کیا ہے؟
۲۔ اکبرالہٰ آبادی کونسا خطاب دیا گیا تھا؟

۳۔ اکبر کا پورا نام کیا ہے؟

۴۔ اکبر کو'خان بہادر' کا خطاب کب دیا گیا؟

5.4.2 اکبرالہ آبادی کی ادبی خدمات

اکبر کی ادبی کارگذاریوں پر نظر ڈالی جائے تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری کی بیشتر اور مقبول اصناف پر تو طبع آزمائی کی ہی ہے ساتھ ہی نثر میں بھی اپنی قابلیت ومہارت کے جوہر دکھائے۔ اُن کی ادبی زندگی کا آغاز صنفِ غزل سے ہوا۔ اکبر کی ادبی خدمات درج ذیل شعری اور نثری کارناموں پر مشتمل ہیں۔

۱۔ غزلیات

۲۔ گنجِ نسیاں (مجموعۂ نظم مختلف موضوعات وہیئت میں نظمیں)

۳۔ رباعیات

۴۔ قطعات

۵۔ مثنویات

نثر میں اُنکے مکاتیب اور تراجم مضامین قدرواہمیت کے حامل ہیں اور ادبی سرمایہ میں گراں قدر اضافے ہیں۔ اکبر کی شاعری کا آغاز روایتی غزل سے ہوا۔ جس میں عشق مجازی کی کیفیت ومعاملات کو اُنہوں نے روایتی انداز میں بیان کیا ہے۔ ان میں جذبات کی شوخی ورنگینی خوبصورت زبان کا اظہار موجود ہے۔

مثلاً یہ شعر -----

ناز و اداسے جو چلیں چال، حضور
جس جگہ پانو پڑے گنجِ شہیداں ہوجائے

لیکن بہت جلد اکبر اس روایتی عشق وعاشقی کے دائرے سے نکل کر عصری حقائق ومسائل کی طرف متوجہ ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب ''اودھ پنچ'' اخبار جاری ہوا تھا۔ اور اس اخبار کے اجراء کے ساتھ ہی طنز ومزاح کے مخصوص دور کا آغاز ہوا۔ اس کا مقصد معاشرے کی برائیاں اور حکومت وقت کو طنز کا نشانہ بنانا تھا۔ چنانچہ اکبر نے بھی اپنی خداداد صلاحیت طنز ومزاح کو بروئے کار لاتے ہوئے عصری حالات کو شعری قالب میں ڈھالا۔ اُس عہد کی شاعری غزلوں کی صورت میں موجود ہے۔ جس میں رنگِ تغزّل آب وتاب کے ساتھ موجود ہے اور موضوع ومضامین کے اعتبار سے ان میں اخلاقی امور اور عصری حالات ومسائل کی جلوہ گری ہے۔ علاوہ ازیں ان میں تصوفانہ افکار اور حیات وکائنات کے مسائل کی بھی نمائندگی نظر آتی

ہے۔بعض اشعار میں موت کا تصور وخوف کا بھی اظہار پایا جاتا ہے۔

اے خوفِ مرگ دل میں جو انساں کے تو رہے
پھر کچھ ہوس رہے نہ کوئی آرزو رہے

تصوف، حیات وکائنات سے ماوراء ہوکر اکبر جب موجودہ ملکی صورتحال پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں اپنی قوم کے بے بسی پر رحم آتا ہے اور قابضِ اقتدار قوم پر عتاب۔ ذیل کا شعر اس ضمن میں پیش ہے جو مظاہر تو حسن وعشق کے معاملے کی عکاسی کرتا ہے لیکن معنوی اعتبار سے اُنکے عہد کی سیاسی صورتحال کا عکاسی ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اکبر کی طنزیہ شاعری ''اودھ پنچ'' کی رہیں منت ہے یہ ہے یہ ایسا اخبار تھا جس نے قدامت پرستی اور مغرب کی کورانہ تقلید کی مذمت کی اور طنز ومزاح کو اصلاحی و ناصحانہ انداز میں رائج کیا اور اسی اخبار کے اجراء کے بعد اکبر کے نظم گوئی کا باقاعدہ آغاز کیا اور ساتھ ہی دیگر اصنافِ شاعری پر بھی طبع آزمائی کی اکبر کی پہلی نظم جو مثنوی کی ہئیت میں اُسکا عنوان ''منظوم خط بنام اودھ پنچ'' ہے۔ یہ ۱۱۵ ایک سو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔

اکبر کی نظموں اور غزلوں کا متاثر کن پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اخلاقی، سماجی، سیاسی موضوعات کو پیش کیا اور جدید نظم گوئی کے تحت مناظر قدرت، اخلاقیت، سیاسی ومعاشرتی صورتحال پر بھی نظمیں لکھیں ان میں علم کی ضرورت، نئی اور پرانی روشنی میں مکالمت، دو تیتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں، پیرو مرشد نے کیا قوم میں بچپن پیدا وغیرہ کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کی مذہب و اسلامی تہذیب سے فراموشی و بے گانگی اور اسکے نتیجے میں اُن کی زبوں حالی پر افسوس کرتے ہوئے نظمیں جلوہ دربار دہلی اور برق کلیسا لکھی۔ جن میں وہ مسلمانوں کے مذکورہ رویوں پر طنز کرتے ہیں۔
جلوہ دربار دہلی میں بہترین منظر کشی سے کام لیا گیا ہے۔ سادہ الفاظ، آسان تراکیب، عام فہم تشبیہات اور قافیوں کا مناسب استعمال اسکی فنی خوبیاں ہیں۔ ہئیت کے اعتبار سے یہ نظم مربع ہئیت میں لکھی گئی ہے۔ اکبر نے نظم کی تمام فارم پر سوائے آزاد نظم کے طبع آزمائی کی۔ ان میں طویل مختصر، مثنوی، معریٰ، رباعی قطعہ، مخمس مسدّس، قصیدہ وغیرہ شامل ہیں۔ معریٰ نظم میں ''چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر'' قابلِ ذکر ہے جو سادہ اور عام فہم ہے موضوع وہئیت کے اعتبار

سے یہ نظم کامیاب ہے۔ یہاں اُس کی بے ثباتی کے ذریعے انہوں نے دنیا کی ثباتی کا فلسفہ وحقیقت پیش کیا ہے۔

اکبر نے بعض شاعروں کے اشعار کی تضمین بھی کی ہیں۔تضمین سے مراد اپنے یا کسی دوسرے شاعر کے مصرعے یا شعر پر مصرعہ یا مصرعے لگانا۔مختصر نظموں کے تحت اکبر نے بلاعنواں نظمیں کہی ہے جو موضوع ومواد کے لحاظ سے پر تاثیر ہیں۔جسمیں علامتیں الفاظ کا مناسب انتخاب، اور مربوط اندازِ ملحوظ رکھا گیا ہے۔

قصیدہ گوئی اکبر کی سخن طرازی کا حصہ رہی۔ایک کوئن وکٹوریہ کے لئے لکھا۔صنف قطعہ پر اُن کی توجہ کا مرکز رہا۔ اکبر نے طویل اور مختصر دونوں قطعات کہے۔اُنکے قطعات کا انفرادی پہلو یہ رہا کہ انہوں نے رباعی کی صورت میں قطعہ لکھا ۔صرف اسمیں فرق بحر کا ہے متنوع موضوع ومضامین اور طنز وظرافت سے آراستہ یہ قطعات اُردو قطعہ کے سرمایے میں مفید اضافہ ہے۔رباعی نما قطعہ کی مثال پیش ہے

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پر مردوں کی پڑ گیا

اکبر نے رباعی کو بھی اپنی توجہٗ خاص سے نوازا۔مثال ملاحظہ ہو :

اُردو میں سب شریک ہونے کے نہیں　　اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امراء القیس بنیں　　پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

ان رباعیوں کی خوبی اُن کی عام اور آسان فہم زبان ہے، جو ان کی حسن ودلکشی کا باعث ہے۔

اکبر کی شعری خدمات سے استفادہ کرنے کے بعد اُن کی نثر نگاری پر توجہ کرتے ہیں تو یہاں بھی اُن کی فکری وفنی قابلیت وصلاحیت کے جوہر کھلتے نظر آتے ہیں ۔نثر میں اُنکے خطوط جو مطبوعہ وغیر مطبوعہ ہیں علاوہ ازیں چند تراجم اور تنقیدی مضامین ہیں۔''مکتوباتِ اکبر'' ان کا پہلا مجموعہ خطوط ہے۔اسکے بعد دو مجموعے'' مکاتیب اکبر'' کے نام سے دو قسطوں میں ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئے۔

اکبر نے مضامین بھی لکھے۔ ان کے مضامین اُن کی تنقیدی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے بعض مصنفین کی تصنیفات سے متعلق مضامین لکھے۔

۱) سہروردیہ بیگم (کلکتہ) کی کتاب ''آئینہ عبرت'' پر تبصرہ مخزن لاہور۔

۲) جوش ملیح آبادی کے اولین مجموعہ نظم ونثر ''روح ادب'' کا دیباچہ۔

ترجمہ نگاری میں اکبر نے دو کتابوں کے ترجمے کے ہیں جو انگریز مصنف ولفرڈ سکاون بلنٹ کی ہیں ایک کتاب ''فیوچر آف اسلام''(Future Of Islam) کا ترجمہ ''مسلمانوں کی حالت آئندہ'' کے نام سے کیا۔ جو ۱۸۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔

مجموعی طور نثر کے اسلوب سے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اسمیں قدیم طرز کا اسلوبِ بیان اور زبان کا استعمال ملتا ہے اور بعض مقامات پر سادہ، رواں دواں، عام فہم انداز۔ گویا اعتدال وتوازن کی حامل نثر جہاں نہ بے حد سادگی ہے نہ پیچیدگی۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اکبر نے اپنی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری سے قوم کی اصلاح کام کیا اور نثری فن پاروں سے ادب کو مالا مال کردیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ اکبر کے مجموعۂ نظم کا نام بتایئے؟

۲۔ اکبر نے کن شعری اصناف پر طبع آزمائی کی؟

۳۔ اکبر کی نثری خدمات کن اصناف میں رہی اور اُن نثری فن پاروں کے نام بتایئے؟

5.5 پنڈت برج نرائن چکبست

5.5.1 پنڈت برج نرائن چکبست کے حالات زندگی

چکبست ۱۸۸۳ء میں بہ مقام فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن لکھنؤ تھا۔ اس لئے وہیں چلے آئے اور تعلیم بھی وہیں سے حاصل کی۔ شعروادب کا ذوق گھٹی محاورہ میں پڑا تھا۔ (بچپن سے کسی چیز کا عادی ہونا) اور لکھنوی مذاق رگ رگ میں رچا ہوا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں کینگ کالج سے بی۔اے (B.A) کرنے کے بعد آپ نے وکالت شروع کی اور اس پیشہ میں آپ کو خاص کامیابی حاصل ہوئی۔ اردو شاعری کی دنیا میں انھیں حیاتِ دوام عطا کرنے کے لئے ان کی نظم

''رامائن کا ایک سین''، ہی کافی ہے۔ اگر وہ مکمل رامائن کو اسی انداز میں پیش کر دیتے تو یہ اردو شاعری کا ایک لافانی کارنامہ ہوتا مگر موت نے انھیں مہلت ہی نہ دی۔ شاعر کبھی کبھی وہ دیکھ لیتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھ پاتے۔ مرگِ شباب کا انھوں نے اندازہ لگایا تھا جو افسوس ہے کہ درست نکلا۔ ۱۲ رفروری ۱۹۲۶ء کو وہ ایک مقدمے کی پیروی کے لئے رائے بریلی گئے۔ شام کو لکھنؤ واپس ہونے کے لئے اسٹیشن پہنچے ریل کے ڈِبے میں بیٹھے ہی تھے کہ دماغ پر فالج کا اثر ہوا اور وہ لمبے سفر کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۴۵ سال کی تھی۔ یہ بھی ایک خوبصورت اتفاق ہے کہ چکبست کا جو شعر زبان زدِ خاص و عام بنا اسی شعر سے ان کی تاریخ وفات بھی نکالی گئی۔ جس میں زندگی اور موت کا فلسفہ موجود ہے۔

ے زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انھی اجزا کا پریشاں ہونا

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ چکبستؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ چکبستؔ کو کس پیشے میں کامیابی حاصل ہوئی؟

۳۔ چکبستؔ کا انتقال کب اور کیسے ہوا؟

5.5.2 چکبستؔ کی نظم نگاری

چکسبت نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ سُرعت سے بدل رہا تھا۔ ایک طرف قدامت کا رنگ تھا جو ابھی سماج پر چھایا ہوا تھا اور دوسری طرف نئی تہذیب کی بڑھتی اور چڑھتی ہوئی روشنی تھی جو آہستہ آہستہ اپنا اثر جما رہی تھی۔ کچھ لوگ قدامت پرست تھے، کچھ ایک نئی دنیا کے خواب دیکھ رہے تھے، کچھ ایسے تھے جو تھوڑی سی اصلاح، تھوڑی سی تبدیلی اور تھوڑی سی رفو گیری کے قائل تھے۔ چکبست اس آخری طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لکھنؤ کی تہذیب تمدن، معاشرت اور اخلاق کے دلدادہ تھے، مگر اس کے ساتھ زمانہ کا رخ دیکھ کر اور روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اصلاح و ترمیم کے بھی حامل تھے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر، اچھے نقاد اور اچھے اہلِ قلم تھے، بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ وہ اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو عزت و آرام کی زندگی گزارنے پر قانع نہیں ہوتا بلکہ قوم کی بہبود اور بہتری کے لئے نہایت نیک خیالات بھی دل میں رکھتا ہے۔ یہ نیک خیالات قدرتی طور پر معتدل اور صلح پسند خیالات ہوتے ہیں۔

چکبست کی شاعری میں موضوعات کا تنوع نہیں ہے لیکن زبان و بیان پر ان کی ماہرانہ قدرت انھیں اردو کے چند نمایاں شعراء میں جگہ دیتی ہے۔ چکبستؔ کا مختصر کلام 'صبح وطن'' کے نام سے ان کی وفات کے سال ۱۹۳۶ء میں طبع ہوا۔ اس میں ۳۶ نظمیں ہیں۔ قریب ۴۰ کے غزلیں۔ کچھ رباعیات اور کچھ متفرق اشعار۔ کل جلد ۱۷۷ صفحات پر مشتمل ہیں۔ نظموں کی تفصیل یوں ہیں کہ کچھ قومی ہیں جن کا تعلق خاص قومی تحریکوں سے ہے یا جن کا محرک حبّ الوطن کا جذبہ ہے۔ کچھ مرثیے ہیں جو قومی رہبروں یا اپنے دوستوں کی موت کی یادگار میں لکھے گئے ہیں، کچھ نظمیں قومی اصلاح کی ترغیب کے لئے تحریر میں لائی گئی ہیں۔ کچھ میں اخلاقی خیالات کی ترجمانی ہے اور کچھ میں تاریخی واقعات کی داستان نظم ہے۔ تین چار نظموں میں قدرتی مناظر کی تصویر کشی کی ہیں اور ایک میں لکھنؤ کے امام باڑہ کا بیان ہے۔

چکبست کی قومی نظموں کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ مذہبی اور فرقہ بندی کے جذبہ سے بالکل آزاد ہیں۔ چکبستؔ کی قومی نظموں کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ان کے جذبے میں اعتدال پسندی اور میانہ روی ہے۔ گو کہ وہ باغِ وطن کی بہار کے پجاری ہیں۔ زمینِ ہند کو رتبہ میں عرش اعلیٰ سے کم نہیں سمجھتے۔ وہ اس پھول کی پھلواری، ساون کی کالی گھٹاؤں، برسات کی ہلکی پھوہاروں، کوئلوں کی کوک، موروں کی صدا، گنگا اور جمنا کی لہروں کے متوالے ہیں، لیکن انھیں اپنے وطن کو جو اصلی چیز سب سے پیاری ہے وہ یہاں کی پُرانی تہذیب ہے۔ اس تہذیب کی بنیاد علم و اخلاق پر ہے۔ ذاتِ انسان کی محبت، مروّت، وفا، صفائی اور خوفِ خدا پر، وہ ہندوستانی تہذیب کے ان اصلی جوہروں کے دلدادہ ہیں۔ وہ اصلاح کے حامی، جہالت، ظلم، عیش پرستی اور ظاہرداری کے دشمن ہیں۔ مغربی تہذیب سے انھیں ردوکد نہیں، نمائش سے عداوت ہے۔ قوم کی لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

نقل یورپ کی مناسب ہے، مگر یاد رہے
خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز

چکبستؔ کی تمام شاعری میں حب الوطنی کا جذبہ مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری اسی جذبے کے اردگرد گردش کرتی نظر آتی ہے۔ غزلیں ہوں، نظمیں یا مرثیے، سب میں اس جذبے کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے شعری مجموعے ''صبح وطن'' سے ان کی نظمیں ''خاکِ ہند''، ''ہمارا وطن دل سے پیارا وطن'' اور ''وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک'' کافی مشہور ہیں۔ ''خاک ہند'' کو خاص طور سے اردو کی وطنیہ شاعری میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس نظم میں چکبستؔ نے بڑے فنکارانہ انداز میں ملک کے روشن ماضی، اسکی روحانی عظمت اور وطن کے ان عظیم رہنماؤں کا ذکر کیا ہے جو ساری دنیا

کے لئے روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا خصوصیت کے علاوہ چکبستؔ کی شاعری میں منظر نگاری وجذبات نگاری کی بہترین مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ منظر کشی اور جذبات نگاری کے لئے جس بلند تخیل، مشاہدے کی گہرائی اور زورِ بیان کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب چکبستؔ کے یہاں بہ حسن وخوبی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے مختلف قدرتی مناظر کی اتنی حسین اور دلکش تصویریں پیش کی ہیں کہ وہ اصل سے بھی زیادہ حسین اور دلکش نظر آنے لگتی ہیں۔ نظم ''جلوۂ صبح'' میں شاعر نے صبح کا بڑا حسین منظر پیش کیا ہے پرندوں کی چہچاہٹ، صبح کی فرحت بخش ہوا اور سبزہ پر شبنم کی بوندوں کی اتنی خوبصورت ودلکش تصویر وہی شاعر پیش کرسکتا ہے جس کا مشاہدہ کافی گہرا ہو، جو فطرت کا حُسن شناس ہو اور فطرت کی کیفیات کو اپنے قلب ونظر میں اتار لینے کا ہنر جانتا ہو۔ چکبستؔ کی ایک اور نظم ''کشمیر'' میں بھی منظر نگاری کے بہترین نمونے ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نظم ''کشمیر'' میں چکبستؔ نے وادیِ کشمیر کی جو خوبصورت تصویر پیش کی ہے اس سے ہر کوئی لطف اندوز ہوسکتا ہے مگر اس شخص کی بات کچھ اور ہی ہوگی، جس نے قدرت کے اس جنت نما باغ کے دلکش مناظر کو اپنے ذہن میں بسا رکھا ہو۔ یہ تصویریں زندگی سے کتنی بھرپور کتنی دلکش و دل آویز معلوم ہوتی ہیں ان کا اندازہ چکبستؔ کے ان اشعار سے ہوتا ہے :

ہر لالۂ کہسار ہے شکل گل راحت
داغ اس کے ہیں خالِ رخ حورائے مسرت
کیا سبز خوشِ رنگ ہے سرمائی عشرت
دل کے لئے ٹھنڈک ہے جگر کے لئے فرحت
ایسا نہیں قدرت نے کیا فرش کہیں پر
اس رنگ کا سبزہ ہی نہیں روئے زمیں پر

چکبست کی نظمیں سادگی اور سلاست کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں۔ فنی ہنرمندی کے ساتھ ساتھ انھوں نے انسان دوستی، جمہوریت پسندی اور حب وطن کو بطور خاص اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے اتحاد واتفاق پر زور دیا تا کہ باطل طاقتیں زور آزمائی نہ کرسکیں۔ انھوں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ جس دن اتحاد واتفاق کی رسی ڈھیلی پڑے گی، ہمارے ملک کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ آزادی کے بعد کی سات دہائیاں اس تناظر میں دیکھی جاسکی ہیں۔ چکبستؔ چاہتے تھے کہ تہذیبی سنگم کو مزید مستحکم کیا جائے، کیونکہ یہ اتحاد واتفاق کی علامت ہے۔ وہ ایک سچے محبِّ وطن تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں کا

موضوع اسی سرزمین (ہندوستان) کے مسائل سے اُخذ کیا ہے۔ان کی نظموں کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عہدِ حاضر کی نئی قدروں اور نئے میلانات کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے مسائل سے کس قدر آشنا تھے۔ایک نظم نگار کی حیثیت سے چکبستؔ نے اپنی الگ شناخت بنائی،جس نے چکبستؔ کو اردو شاعری میں زندہ جاوید کر دیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ چکبستؔ کا مختصر کلام 'صبح وطن'' کب شائع ہوا؟

۲۔ چکبستؔ نے اپنی نظموں کے موضوعات میں کس موضوع کے اظہار کو لازمی بنایا تھا؟

5.6 جوشؔ ملیح آبادی

5.6.1 جوشؔ ملیح آبادی کے حالات زندگی

جوشؔ کے والد کا نام بشیر احمد خاں اور تخلّص بشیرؔ تھا۔کہا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا خوبصورت انسان تھے۔فارسی زبان اور تاریخ اسلام پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔جوش ۰۵ ر دسمبر ۱۸۹۸ء کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔گھر پر ابتداءِ تعلیم ختم ہونے کے بعد انھیں مزید تعلیم کے لیے سیتا پور بھیج دیا گیا۔ڈیڑھ سال بعد والد نے جوش کو سیتا پور سے بُلا کر لکھنؤ کے جوبلی ہائی اسکول میں داخل کر دیا پھر انھوں نے لکھنؤ کے چرچ مشن اسکول میں تعلیم پائی۔اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے جوش علی گڑھ گئے۔شرارتوں کی وجہ سے انہیں کالج سے نکال دیا گیا اور آگرہ آگئے۔جہاں انھوں نے پیٹرز کالج میں سینئر کالج تعلیم پائی۔

والد کے انتقال کے بعد جوشؔ شعر و شاعری میں ایسے مصروف ہوئے کہ ان کی جائیداد کا بہت بڑا حصہ ہڑپ کر لیا گیا۔جب ہوش آیا تو ان کے پاس کچھ باقی نہیں تھا۔مجبوراً انھیں ملازمت کی تلاش میں حیدرآباد جانا پڑا۔جہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں مترجم کے طور پر ان کا تقرر ہو گیا۔سات آٹھ سال تک جوشؔ حیدرآباد میں رہے۔ان کی ایک نظم سے حیدرآباد کے نواب میر عثمان علی خان ایسے ناراض ہوئے کہ انہوں نے جوش کو حیدرآباد چھوڑنے کا فرمان صادر کر دیا۔اس کے بعد جوشؔ نے فلموں میں کام کیا اور پھر ماہانہ ''آج کل'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔اس کے بعد پاکستان چلے گئے، جہاں ان کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔یہیں انھوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا اور فارسی کے بڑے شاعروں مثلاً سعدیؔ،حافظؔ،خیامؔ،عرفیؔ اور خاقانیؔ وغیرہ کا کلام پڑھا۔۲۲ ر فروری ۱۹۸۲ء کو ان کا اسلام آباد میں انتقال ہو گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ جوشؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ حیدر آباد کے نواب میر عثمان علی خان نے جوش کو حیدر آباد چھوڑنے کا فرمان کیوں صادر کیا؟

۳۔ جوشؔ کس ماہنامے کے ایڈیٹر مقرر ہوئے؟

۴۔ جوشؔ کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

5.6.2 جوشؔ کی نظم نگاری

جوشؔ کے والد کو یہ پسند نہیں تھا کہ جوشؔ شاعری کریں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پوری کوشش کی تھی کہ جوش شعر گوئی سے باز آجائیں۔ اس سلسلے میں جوش نے اپنے پہلے مجموعہ کلام کے دیباچے میں لکھا ہے کہ۔

''میں نے نو برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات میں نے خلاف واقعہ لکھی ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ میں شعر نہیں کہتا تھا بلکہ شعر خود کو مجھ سے کہلواتا تھا۔''

جوشؔ نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی تھی۔ لیکن بہت جلد نظم گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ غزل اور نظم کے علاوہ انہوں نے مرثیے، سلام، گیت، رباعیاں اور قطعے بھی کہے۔ جوش کو شاعر انقلاب، شاعرِ شباب اور شاعر فطرت کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کی انقلابی فکر ہے۔ برطانوی حکومت کے ظلم وستم نے ان میں بغاوت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ ان میں انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزاد کرانے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار تھے۔

برطانوی سامراج کے خلاف اور جنگ آزادی کے موضوع پر اردو میں بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں لیکن اس موضوع پر جوش کی نظموں کا معیار بلند ہے اور آزادی حاصل کرنے کے جذبے کی شدت جتنی جوش کی نظموں میں ہے اتنی شاذ و نادر ہی کسی شاعر کے ہاں ملے گی۔

جوشؔ ہماری جنگِ آزادی کے سب سے قد آور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری نے لاکھوں مجاہدین میں آزای حاصل کرنے کا عزم پیدا کیا۔ سر پر کفن باندھ کر آزادی کے میدان جنگ میں اترنے کے لیے ولولہ، ہمت اور حوصلہ پیدا کیا۔ جوش نے جنگ آزادی کے سلسلے میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے'' کے عنوان سے جو نظم لکھی تھی اسے جنگِ آزادی کے مجاہدین اور محب وطن ہندوستانیوں میں جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی زمانے میں اردو کی کسی نظم کو

حاصل نہیں ہوئی۔ یہ نظم لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کی گئی تھی۔ یہ چھپی ہوئی نظم نئی دہلی کے نیشنل آرکائیوز میں جنگِ آزادی کے دوران ضبط ہونے والے ادب کے ذخیرے میں موجود ہے۔ کسی سرکاری افسر نے اس نظم پر ایک نوٹ لکھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ 'یہ نظم لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر ہندوستان اور خاص طور سے یو۔پی، بنگال اور پنجاب میں تقسیم کی گئی۔ اس نظم کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ مجاہدینِ آزادی جلوس کی صورت میں شہر کا چکر لگاتے اور سب مل کر یہ نظم پڑھتے تھے۔ برطانوی حکومت نے یہ نظم ضبط کر لی تھی۔ اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کس زبان سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگر؟
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی، پڑے امن و بقا
باغِ انسانی میں چلنے کو ہی کو ہے بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں

ہم جنگِ آزادی کے اس زمانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے جب دنیا کی سب سے بڑی طاقت یعنی برطانوی حکومت سے نہتے ہندوستانی صرف اپنی ہمت اور حوصلے کے بل پیر وطنِ عزیز کی آزادی کے لیے ظالم سامراجیوں سے لوہا لے رہے تھے۔ اس وقت ہزاروں کی تعداد میں مجاہدینِ آزادی دار و رسن کی آزمائش سے گذر رہے تھے۔ جوش نے ''بغاوت'' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی تھی۔ یہ نظم ایک جانباز مجاہد ہی لکھ سکتا تھا جسے موت کا خوف نہ ہو۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہاں بغاوت، آگ، بجلی اور آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل، میرے جلو میں قتلِ عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات
کانپ اٹھتی ہے میری چینِ جبین سے کائنات
الحذر، میری کڑک کا زور، ہنگامِ مصاف
صاف پڑ جاتا ہے ایوانِ حکومت میں شگاف

جوش کی ایک نظم ہے جسمیں انقلاب کا نعرہ اس طرح کیا گیا ہے جیسے آندھی اور طوفان کی طرح مجاہدوں کی فوج دشمنوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ وطن کی محبت اور اس پر قربان ہونے کے جذبے نے اس فوج کے ہر سپاہی میں شہادت کا وہ جذبہ پیدا کر دیا ہے جو انسان کو دنیا کے ہر خطرے سے اور حد تو یہ ہے کہ موت سے بھی بے خوف کر دیتا ہے۔ اس نظم کے

چند اشعار یہ ہیں۔

؎ کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
کوئی قوتِ راہ مجھ سے ہٹا سکتی نہیں
کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں
پھر اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا
گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا
ولولوں سے برق کی مانند لہراتا ہوا
موت کے سائے میں رہ کر موت پر چھاتا ہوا۔

جنگِ آزادی کے موضوع پر جوشؔ کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو اردو کے ادبی تاریخ کا اہم حصہّ ہے اور جنگِ آزادی کی تاریخ بھی ہیں۔ اس موضوع پر جوشؔ کی بعض نظمیں ہمیشہ جنگِ آزادی کی تاریخ کا اہم حصہّ رہیں گی۔ یہ نظمیں ہیں۔ ''بیدار رہو بیدار'' ''غدار سے خطاب'' , ''شکستِ زنداں کا خواب'' ''بھوکا ہندوستان'' , ''زنداں کا گیت'' , ''دردِ انقلاب'' , ''اٹھ اے ندیم'' اور ''کسان''۔ ان کے علاوہ بھی اس موضوع پر خاصی تعداد میں نظمیں ہیں۔

جوشؔ۔۔۔۔۔شاعرِ فطرت

جوشؔ اردو کے واحد شاعر ہیں جنھیں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ انہیں شاعرِ فطرت بھی کہا جاتا ہے۔ اردو میں فطرت نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس کے بہت اچھے نمونے ہمیں اردو مثنویوں میں مل جاتے ہیں لیکن جوش نے فطرت نگاری کے فن کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔ جوش کو فطری مناظر سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ مناظر فطرت کے زبردست عاشق تھے۔ انہیں صبح کو پو پھٹنے کا منظر بہت پسند تھا۔ اسی لیے وہ صبح چار بجے اٹھ کر باغوں کی سیر کو چلے جاتے تھے۔ صبح کے حسین مناظر سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ صبح کے مناظر انہیں اتنے دلکش لگتے تھے کہ کہا کرتے تھے ان میں انھیں قدرتِ حق کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ جوش کی ایک نظم ''پیغمبرِ فطرت'' ہے۔ اس نظم کے شروع میں جوش نے صبح کا منظر انتہائی خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

تاروں نے جھلملا کے جو چھیڑا ستار صبح
گانے لگی چمن میں نسیم بہار صبح

غنچوں میں چشم ناز سے ٹپکا خمارِ صبح
ابھر اقفق سے جام زمّرد نگار صبح
شاعر کی روح عشق کی ہم راز ہوگئی
دنیا تمام جلوہ گہہ ِ ناز ہو گئی

جوشؔ فطرت کی منظر کشی خوبصورت استعاروں نادر تشبیہوں، اچھوتے تخیل اور معنی آفرینی سے کام لیتے ہیں۔ وہ جزئیات نگاری سے کام لے کر منظر کی پوری تصویر اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ تصویر کا ایک ایک پہلو دل و دماغ پر نقش ہوجاتا ہے۔ جوش کی ایک نظم ہے۔ ''پانچ نغمے'' اس نظم کے تیسرے بند یا تیسرے نغمے میں جوش نے چڑیوں کی حرکات و سکنات بہت دلچسپ سادہ اور دلنشین انداز میں بیان کی ہے۔ مثال کے طور یہ بند ملاحظہ فرمائیں۔

مہکتے ہوئے پھول کے پاس آؤ
لچکتی ہوئی شاخ پر بیٹھ جاؤ
ہوا میں کبھی اڑ کے بازو ہلاؤ
کبھی صاف چشمے میں غوطہ لگاؤ

یونہی پیاری چڑیوں ابھی اور گاؤ

جوشؔ کی منظر نگاری

جوشؔ کا مشاہدہ بہت گہرا اور سیع ہے۔ وہ جب بھی کوئی منظر پیش کرتے ہیں اس کی تمام تفصیلات اسطرح بیان کرتے ہیں جیسے وہ کسی مقام پر کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے ''گرمی اور دیہاتی بازار''۔ شاعر تو کیا کسی نثر نگار نے بھی دیہاتی بازار کا ایسا منظر نہ کھینچا ہوگا۔ جیسا جوش نے اس نظم میں پیش کیا ہے۔ دیہاتی زندگی کا بہت قریب سے اور بہت گہرا مشاہدہ کیا اور نظم لکھتے ہوئے ان کے ذہن میں دیہاتی بازار کا پورا منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ محفوظ تھا۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں دیہاتی بہار کی مکمل عکاسی کی گئی ہے :

شور، ہلچل، غلغہ، ہیجان، لو، گرمی، نجار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں، قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھنا ہٹ، گڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز گھاس

جب برسات کی پہلی گھٹا جھوم کر برستی ہے تو خوشی و مسرت اور کیف و سرور سے جوش بھی جھوم جھوم جاتے ہیں اور اس حسین منظر کو ایسے دلکش الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ سننے والے کے دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے :

کیا جوانی ہے فضا میں مرحبا صد مرحبا
چل رہی ہے روح کو چھوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
آ رہی ہے دور سے کافر پپیہے کی صدا
حُسن اٹھا ہے خاک سے انگڑائیاں لیتا ہوا
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

جوش کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے 'غریب الوطن کا پیام'۔ اس نظم میں ایک ایسے شخص کے جذبات بیان کئے گئے ہیں جو فطری مناظر سے دور شہر کے ہنگاموں میں زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ اس نظم کے آخری حصے کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :

اے چاند جب ستارے گردوں پر جھلملائیں
جب قدرتی مناظر صحرا میں مسکرائیں
تاروں کی کشمکش میں جب چاندنی ہو پھیکی
چادر سرک گئی ہو ماتھے سے جب کسی کی
مغموم جھاڑیوں سے میرا سلام کہنا
آنکھوں میں اشک بھر کر پھر یہ پیام کہنا

جوش فطرت اور اس کے مختلف مظاہر کے پرستار ہیں۔ چڑیوں کی حرکات و سکنات ہوں یا آسمان پر چھائی گھٹا، برسات کی رم جھم ہو یا شفق کا منظر، دیہاتی بہار ہو یا زمین پر موتی بکھیرتی ہوئی آبشار، جوش کے لیے فطرت ایک بے جان شئے نہیں بلکہ اس کا اندازہ وجود ہے۔ جوش کا عقیدہ ہے کہ جنگل، گلشن اور فطرت سے جو محبت اور خلوص انسان کو ملتا ہے وہ انسانوں سے نہیں ملتا۔ دوست بے وفا ہو سکتے ہیں لیکن فطرت کبھی بے وفائی نہیں کرتی انسان سے فطرت کی دوستی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی جوشؔ کی شاعری کے کچھ زیادہ قائل نہیں۔ جوش کی شاعری کے فکری عنصر پر انھوں نے بہت سخت تنقید کی ہے لیکن مناظرِ فطرت کی کامیاب پیش کش کا انھیں بھی اعتراف ہے۔ فرماتے ہیں :

''جوش نے مناظرِ فطرت پر جس کثرت سے نظمیں لکھی ہیں اس کی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملے گی۔ صبح و شام، برسات کی بہار، گھٹا، بدلی کا چاند، ساون کے مہینے، پچھلا پہر، گنگا کا گھاٹ ۔ یہ تمام مناظر جوش کی نظموں میں رقصاں و جولاں ہیں''

تاجدار صبح، البیلی صبح، بدلی کا چاند، آبشار نغمہ، سحر، برسات کی چاندنی، اور لیلیِ شب وہ لازوال نظمیں ہیں جو شاعر فطرت کی حیثیت سے جوش کی حیاتِ دوام کی ضامن ہیں۔

جوشؔ، شاعرِ حُسن و عشق

جوش نے حسن اور عشق کے موضوع پر بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں میں جوش کا تجربہ، مشاہدہ، جذبہ، حسن سے فطری لگاؤ وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہے۔ جوش حسن کو ہر انداز میں، ہر رنگ میں دیکھتے ہیں۔ جوش حُسن کے عاشق ہیں۔ یہ حسن فطرت میں ہو یا انسان میں۔ وہ جمال پرست ہیں۔ زندگی کی رعنائیوں سے وہ ایک شاعر، ایک انسان دوست اور ایک مفکر کی حیثیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ حسن کی جلوہ سامائیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ان کی رومانی نظمیں مثلاً ''انتظار کے دن'' ''یہ کون اٹھا ہے شرماتا''، ''اٹھتی جوانی''، ''پیغام بہار'' ''امینِ شباب'' اور ''اپنی ملکہ سخن سے'' ''شراب آغوش'' ''جنگل میں منگل'' اور ''برسی ہوئی آنکھیں'' ایسی خوبصورت اور دلآویز رومانی نظمیں ہیں کہ اردو میں ان کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

جوشؔ نے ''گنگا کے گھاٹ پر'' کے عنوان سے ایک رومانی نظم لکھی ہے۔ اس نظم میں ایک ایسی لڑکی کی تصویر کشی ہے جو گنگا کے گھاٹ سے نہا کر آرہی ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ جوشؔ نے اس نظم میں الفاظ کے جادو سے حسن کی زندہ جاوید تصویر بنا دی ہے۔ نظم کے کچھ اشعار اسطرح ہیں۔

بڑھائے سرخ عارضی ہوائے صحرا سے
نہایا کون چلا آرہا ہے گنگا سے
سرا دلائی کا سر پر نظر جھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل، بدن چرائے ہوئے

دراز زلف میں جادو ، سیاہ آنکھ میں مدھ
نسیم صبح ہے بنارس ، ہلالِ شام ِ اودھ
ازل کے دن سے در حسن کا بھکاری ہوں
اِدھر بھی ایک نظر میں ترا پجاری ہوں

جوشؔ حسن کی دلکشی اور دلآویزی کی تصویر کشی میں ایسے گم ہوجاتے ہیں کہ ان کی بعض نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حسن کی اداکاریوں اور رنگینیوں کو ایک ایسے مصور کی طرح پیش کرتے ہیں جو منظر سے زیادہ اپنی فنی مہارت دکھانے کی زیادہ کوشش کرتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''کوہستانِ دکن کی عورتیں'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یہ اُبلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں ، آدمی کے روپ میں
چال جیسے تند چشمے ، تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال
کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنھیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں
کیا خبر کتنے دنوں کی جوش پامالی ہوئی
ان اداؤں سے کہ طوفان کی ہیں پالی ہوئی

پروفیسر آل احمد سرور نے جوشؔ کی نظم گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''جوشؔ کی حسن کاری میں کلام نہیں۔ ان کی تشبیہات جاندار، دلکش اور معنی خیز ہوتی ہیں۔ ان کا تخیل لالہ کار ہے مگر دور رس نہیں انسانیت سے اس قدر گہری محبت اور اس کے روشن مستقبل پر یقین محکم نے ان کے کلام میں بڑی آب و تاب پیدا کردی ہے۔''

جوشؔ کسی بھی موضوع پر نظم کہتے ہیں تو الفاظ و بیان پر اپنی قدرت کا پورا استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات واستعارات نئے نئے الفاظ کے استعمال میں اردو کا کوئی بھی شاعر جوش کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ جوشؔ نے شاعری کی ابتدا کس صنف سے کی؟

۲۔ جوشؔ کی شاعری کا اہم پہلو کیا ہے؟

۳۔ جوشؔ کی کس نظم کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی؟

5.7 خلاصہ

اکبرالہٰ آبادی کا پورا نام سید اکبر حسین تھا۔ ۱۸۴۶ء میں داؤدنگر بہار میں پیدا ہوئے۔ اکبر کا عہد ہر اعتبار سے تبدیلیوں اور انتشار کا عہد تھا۔ انکے عہد میں ہندوستانی تاریخ کا المناک اور خونریز واقعہ ۱۸۵۷ء کی غدر جیسے پہلی جنگ آزادی ہند کہا جاتا ہے۔ رونما ہوا تھا جسکے نتیجے میں مسلمان سب سے زیادہ انگریزی حکومت کے عتاب کے شکار ہوئے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے پر یاس و مایوسی صورتحال میں گزارا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مذہب اور اسکول کی گھر ہی حاصل کی بعد میں اسکول میں داخل ہوئے لیکن ایک سال بعد غدر کے ہنگامے سے اسکول بھی چھوٹ گیا۔ اور اس خون خرابے نے تہذیب و مذہب تعلیم و ملازمت سب کچھ برباد کر دیا۔ مالی مسائل و مشکلات سے سبھی ہندوستانی مسلمان دوچار ہوئے۔ اکبر نے بھی مالی مسائل سے مجبور ہو کر کم عمری میں ہی ملازمت کی تلاش شروع کر دی اور مختلف عہدوں پر اُنکی قابلیت و صلاحیت کے بوتے پر اُن کا تقرر عمل میں آیا۔ انھیں برطانوی حکومت نے ''خاں بہادر'' کا خطاب بھی دیا اکبر کو قانون سے بے حد دلچسپی تھی چنانچہ ملازمتیں بھی عدالتی شعبہ کی ہی ابھیں تفویض ہوئی۔ اکبر کی شادی کم عمری مین ہوئی تھی۔ بیوی عمر میں اُن سے بڑی تھی جس سے انھیں دو بیٹے تھے۔ اکبر نے اُن کی پرورش پر خاص دھیان نہیں دیا۔ دوسری شادی ایک طوائف سے اور تیسری شادی صغریٰ نامی نیک بی بی سے کی۔ جن سے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ اکبر کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ اورانہوں نے صنفِ غزل کو مقامِ ابتداء بنایا بعد میں ۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین نے ''اودھ پنچ'' اخبار جاری کیا جو طنز و مزاح کی روایت کو ایک نئے انداز سے جاری کر چکا تھا۔ اکبر نے اس اخبار میں اپنی طنزیہ و مزاحیہ نظمیں لکھی۔ اُنکی نظموں کا مجموعہ ''گنج نسیاں'' ہے۔ انہوں نے مختلف موضوع و ہیئت فین نظمیں کہیں، 'کلیاتِ اکبر' میں غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی۔ نثر میں بھی انہوں نے اپنی گرانقدر خدمات انجام دی۔ نثر میں خطوط، تراجم اور تنقیدی مضامین کا مختصر و قلیل مگر بیش بہا سرمایہ اُردو ادب کو دیا۔

5.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰-۱۰ سطروں میں دیجئے۔

۱۔ اکبرؔ الٰہ آبادی کے عہد کا جائزہ پیش کیجئے۔

۲۔ اکبرؔ الٰہ آبادی کے خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ چکبستؔ نے اپنی شاعری میں حب الوطنی کے موضوع کو کیوں اہمیت دی؟

۴۔ جوشؔ کی فطرت نگاری پر روشنی ڈالیے۔

۵۔ جوشؔ کی نظموں میں فطرت نگاری پر روشنی ڈالیے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ اکبرؔ الٰہ آبادی کی سوانح حیات پر مفصل بحث کیجئے۔

۲۔ اکبرؔ الٰہ آبادی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیجئے۔

۳۔ اکبرؔ الٰہ آبادی کی شعری اور نثری خدمات پر مفصل مطالعہ پیش کیجئے۔

۴۔ چکبستؔ کی نظموں کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۵۔ چکبستؔ کی نظموں میں منظر نگاری پر نوٹ لکھیے۔

۶۔ جوشؔ : بحیثیت شاعرِ انقلاب --- پر تفصیلی گفتگو کیجیے۔

۷۔ جوشؔ کی شاعری کی خصوصیات پر اظہار خیال کیجیے۔

5.9 فرہنگ

رہینِ منت	احسان مند، شکر گذار	کورانہ تقلید	اندھی تقلید
جبر واستبداد	ظلم وستم	اسلاف	اگلے وقتوں کے لوگ، آباءواجداد، بزرگ
خون آشام	خونخوار، خون پینے والا	اجیرن ہونا	دشوار ہونا، دُوبھر ہونا
مذّمت	برائی	منبع	نکلنے کی جگہ
سحر	جادو	مسحور	جس پر جادو کیا گیا ہو

عتاب	غصہ،قہر	خندہ رُوئی	خوشی،شگفتگی
مقلدین	تقلید یا پیروی کرنے والے	وسیع القب	کھلے دل والا،فراخ دل
قابلِ تحسین	تعریف کے قابل	منشا	ارادہ،مقصد
شائق	شوقین،آرزومند	تفویض کرنا	سپرد کرنا،حوالے کرنا
سرعت	جلدی،تیزی	تنوع	قسم قسم کا
محرک	حرکت دینے والا	سلاست	نرم اور ہلکے پھلکے الفاظ استعمال کرنا

5.10 معاون کتابیں

۱۔ علی گڑھ میگزین اکبر طنز ۱۹۵۰ء

۲۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح : وزیر آغا،

۳۔ بزم اکبر: مولوی قمرالدین احمد صاحب بدایونی

۴۔ اکبرالہٰ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ : ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

۵۔ رقعات اکبر

۶۔ خطوطِ اکبر

۷۔ اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ : ڈاکٹر صغری مہدی

۸۔ مشاہیر کے خطوط : عبدالماجد دریا آبادی

☆☆☆

اکائی: 6۔ مرزا محمد رفیع سودا، میر درد، میر تقی میر

ساخت :

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 مرزا محمد رفیع سودؔا، خواجہ میر دردؔ اور میر تقی میرؔ کا عہد

6.4 مرزا محمد رفیع سودا

6.4.1 سودا کے حالات زندگی

6.4.2 سودا کی غزل گوئی

6.5 خواجہ میر درد

6.5.1 خواجہ میر درد کے حالات زندگی

6.5.2 خواجہ میر درد کی غزل گوئی

6.6 میر تقی میرؔ

6.6.1 میر تقی میرؔ کے حالات زندگی

6.6.2 میر تقی میرؔ کی غزل گوئی

6.7 خلاصہ

6.8 نمونۂ امتحانی سوالات

6.9 فرہنگ

6.10 معاون کتابیں

6.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہم اردو زبان کے مشہور شعرا مرزا محمد رفیع سودؔا، خواجہ میر دردؔ اور میر تقی میر کی زندگی کے چند پہلو اور ان کی غزل گوئی سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔ اس اکائی کے مطالعے سے طلبا و طالبات عہد آفریں شعرا سے نہ صرف واقف ہوں گے بلکہ غزل گوئی کی تاریخ میں میر کی عظمت سے بھی آگاہ ہوں گے۔

6.2 تمہید

مرزا محمد رفیع سودا اردو کے مشہور شاعر ہیں اگرچہ ان کی شہرت ایک قصیدہ گو کی حیثیت سے ہے تاہم انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں ان کی غزلیں بھی اپنی مثال آپ ہیں حالاں کہ ان کی غزل گوئی پر بہت زیادہ نہیں لکھا گیا، اس اکائی میں ہم ان کے عہد، ان کی سوانح اور ان کی غزل گوئی سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

اردو غزل کی تاریخ بالخصوص اٹھارہویں صدی کے شعرا میں خواجہ میر درد کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے ان کی صوفیانہ اور شاعرانہ عظمت ہی کے سبب ان کی شاعری اور شخصیت دونوں میں اس پورے عہد کی عکاسی ملتی ہے اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان کے بغیر اردو غزل کی تاریخ نامکمل کہلائے گی انھوں نے اردو غزل کو ایک نیا صوفیانہ آہنگ دیا اس اکائی میں ہم ان کے عہد، ان کی حیات اور غزل گوئی کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

غزل اردو کی بے حد مقبول صنف سخن ہے، امیر خسرو سے لے کر تا حال غزل گو شعرا کی ایک طویل فہرست ہے۔ میر تقی میر اسی فہرست کا ایک ایسا روشن نام ہے جسے خدائے سخن بھی کہا جاتا ہے۔ میر کی غزل گوئی اپنا ایک الگ امتیاز اور اختصاص رکھتی ہے اس اکائی میں ہم میرؔ کی حیات ان کے عہد اور ان کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

6.3 مرزا محمد رفیع سودؔا، خواجہ میر دردؔ اور میر تقی میرؔ کا عہد

۱۷۰۷ء میں مغلیہ سلطنت کے آخری باوقار اور بااختیار بادشاہ اورنگ زیب نے اس جہان فانی سے کوچ کیا اور ۱۷۰۷ء ہی میں مرزا محمد رفیع سودا نے اس عالمِ رنگ و بو میں قدم رکھا۔ مشہور مغل بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد اس کے جانشینوں میں تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے خانہ جنگیاں ہوئیں۔ اورنگ زیب کا بڑا بیٹا معظم بہادر شاہ تلوار کے بل بوتے پر تخت نشین ہوا چار سال بعد فوت ہوا اس کے مرتے ہی اس کے بیٹوں نے تخت کے لیے

اپنی تلواریں بے نیام کرلیں جنگ ہوئی اور جنگ کے نتیجے میں جہاں دارشاہ تخت نشین ہوا، وہ افیم اور شراب کا عادی تھا اس کے عادات واطوار میں شاہانہ رمق بالکل بھی نہ تھی، جس کی وجہ سے انتظام سلطنت چند ماہ میں بکھرنے ٹوٹنے لگا۔ بادشاہ کے غلط طور طریقوں نے معاشرے میں اخلاقی خرابیاں پیدا کیں۔ خزانہ دن بہ دن خالی ہونے لگا۔ اس کے زمانے میں ذہین اور عالم وفاضل لوگ دربار سے خارج کر دیے گئے اوران کی جگہ گانے والوں، بھانڈوں اور مسخروں نے لے لی۔ ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ جہاں دارشاہ کا بھتیجا فرخ سیر بنگال سے ایک بڑی فوج لے کر آیا اور اپنے چچا کو شکست دے کر تخت حاصل کرلیا۔ فرخ سیر بھی غیر مستقل مزاج اور کمزور طبیعت کا انسان تھا اس کے اندر انتظامی صلاحیت بالکل نہ تھی چنانچہ وہ امرا کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہی بنا رہا۔ ۱۷۱۸ء میں فرخ سیر کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اسی کے زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی سہولتیں حاصل کرلیں تھیں اسی کے ساتھ کمپنی کے سکے کو مغل سلطنت میں چلانے کی اجازت بھی مل گئی۔ فرخ سیر کے بعد جو خرابی اور پیدا ہوئی وہ تھی محمد شاہ رنگیلا کی تخت نشینی، محمد شاہ کے زمانے میں امرا نے ملک کو سازشوں اور خانہ جنگیوں کی آماجگاہ بنا دیا تھا ہر طرف انتشار پھیل گیا تھا، معاشرے کا اتحاد دن بہ دن پارہ پارہ ہوتا جا رہا تھا۔ معاشی مسائل پیدا ہوئے لوگ بے روزگار ہوتے چلے گئے۔ ایسے میں بیرونی حملہ آوروں کو موقع ملا اور نادرشاہ نے حملہ کر کے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ غرض اٹھارہویں صدی جس میں بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے، انتہائی پرآشوب زمانہ تھا۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ اور میر تقی میرؔ بھی اسی عہد میں پیدا ہوئے جو سیاسی، سماجی، ملکی اور اقتصادی اعتبار سے سخت انتشار اور افراتفری کا دور تھا۔ مغلیہ سلطنت انتہائی کم زور پڑ چکی تھی۔ سوداؔ کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے پرآشوب زمانہ ہے۔ مغل سلطنت کے قصر بلند کے ستون اور بام و در جس تیزی کے ساتھ اس دور میں زمیں بوس ہوئے اس کا ذکر مورخین نے بہت تفصیل کے ساتھ کیا ہے خصوصاً نا اہل بادشاہوں کی تخت نشینی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں کسی المیے سے کم نہیں ان نا اہل بادشاہوں کی کمزوری اور بے صلاحیتی سے فائدہ اٹھا کر کبھی نادرشاہ درانی نے دہلی میں قتل عام کیا اور ہزاروں اونٹوں، ہاتھیوں اور گھوڑوں پر کروڑوں کی دولت دہلی سے لوٹ کر لے گیا جس میں کونور ہیرا اور تخت طاوس بھی شامل تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے تابڑتوڑ کئی مرتبہ لشکرکشی کر کے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ کبھی مرہٹوں نے اسے تباہ کیا تو کبھی سکھوں نے، کبھی روہیلوں نے اس کے باشندوں کو لوٹ کر قلاش کیا تو کبھی امرائے سلطنت کی خانہ جنگیوں نے اور کبھی جاٹوں نے اس کی انتہائی خوش حالی کو افلاس کی پستیوں میں دھکیلا اور کبھی سلطنت مغلیہ اور دہلی کے انحطاط و زوال کے تابوت میں آخری کیل برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جڑ دی۔

غرض اٹھارہویں صدی کا ہندوستان سیاسی وسماجی اور معاشی انتشار کا شکار تھا۔ قتل وغارت گری، ظلم وستم۔ حکمرانوں کی نا اہلی اور یکے بعد دیگرے تخت پر قبضے نیز اندرونی طاقتوں کی بغاوتوں اور خودمختاری کی وجہ سے تمام ملک میں بےچینی

اور بے یقینی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔گردش زمانہ نے جمی جمائی پُررونق محفلوں کو اجاڑ کر ویران کر دیا تھا، زندگی کی بساط الٹ کر رہ گئی تھی۔عوام کی اندگی شدید بحران کا شکار، معاشی بدحالی کی وجہ سے عام انسان کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔اہلِ اقتدار یا تو عیش و مستی میں زندگی بسر کر رہے تھے اور اپنے فرائضِ منصبی سے غفلت برت رہے تھے یا پھر خود بھی بربادی و تباہی کی جیتی جاگتی مثال بن گئے تھے۔درباری سازشوں اور امرا کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بادشاہوں پر برا وقت آپڑا تھا ۔انھیں جب جی چاہے قتل کر کے ان کی جگہ دوسرے شہزادوں کو حکومت کی باگ ڈور سونپ دی جاتی تھی اور اس کے پس منظر میں اپنا فائدہ حاصل کیا جاتا تھا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ اورنگ زیب کی وفات کس سن میں ہوئی ؟

۲۔ کس بادشاہ کے غلط طور طریقوں نے معاشرے میں اخلاقی خرابیاں پیدا کیں؟

۳۔ فرخ سیر کیوں امرا کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہی بنا رہا؟

۴۔ کس بادشاہ نے کوہِ نور ہیرا اور تخت طاوس کو لوٹا؟

۵۔ اٹھارہویں صدی میں عوام کس طرح زندگی بسر کر رہے تھے؟

۶۔ اٹھارہویں صدی میں اہلِ اقتدار کس طرح زندگی بسر کر رہے تھے؟

6.4 مرزا محمد رفیع سودا

6.4.1 سودا کے حالات زندگی

مرزا محمد رفیع سودا کے آباواجداد بخارا سے آئے تھے۔سودا کے والد کا نام مرزا شفیع بتایا جاتا ہے۔چوں کہ سودا کے بزرگ بخارا سے ہندوستان آکر دہلی میں آباد ہوئے تھے،اس لیے اس بات کا پورا امکان ہے کہ سودا کے والد مرزا شفیع دہلی میں پیدا ہوئے۔سودا کے آباواجداد سپاہی پیشہ تھے اور سپاہی کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے اور بزرگوں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن سودا کے والد مرزا شفیع کا پیشہ البتہ تجارت تھا۔کچھ ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ مرزا شفیع اپنے زمانے کے مشہور تاجر تھے اور مرتے ہوئے انھوں نے خاصی دولت چھوڑی تھی جسے سودا نے دوست نوازی میں ختم کر دی۔

سودا کی ولادت ۱۷۰۷ء میں ہوئی۔ سودا نے دہلی میں پرورش پائی۔ یہیں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ انھوں نے ان علوم کی تعلیم حاصل کی جوان کے زمانے میں رائج تھے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی کا بہت اچھا مطالعہ کیا۔ تھوڑی بہت عربی پڑھی تھی۔ دہلی میں آجکل جہاں کابلی دروازہ ہے اس کے آس پاس بہت بڑی آبادی تھی۔ سودا کا آبائی مکان اسی آبادی میں تھا۔ اب نہ کابلی دروازہ موجود ہے۔ نہ اس کے اردگرد جو مکان تھے ان کا نام ونشان باقی ہے۔

سودا کی ادبی زندگی کا آغاز فارسی شعرگوئی سے ہوا۔ سراج الدین علی خان آرزو سودا کے زمانے کے فارسی کے بہت بڑے عالم اور فارسی شاعر تھے۔ سودا نے ان کی شاگردی اختیار کرلی۔ ایک فارسی داں نے (جو ہمارے خیال سے خانِ آرزو ہی تھے) سودا کو مشورہ دیا کی وہ کتنی اچھی شاعری کیوں نہ کرلیں، فارسی کے ممتاز شاعروں کا مقابلہ نہیں کرسکتے اس لیے بہتر ہے کہ وہ اردو میں شعر کہیں۔ ایسے مشوروں اور اردوشاعری کی بڑھتی مقبولیت نے سودا کی توجہ اردوشاعری کی طرف مبذول کرائی۔

جیسا کہ بتایا جاسکتا ہے کہ جب سودا نے فارسی میں شعرگوئی شروع کی تو انھوں نے خانِ آرزو کی شاگردی اختیار کرلی تھی۔ اس کے بعد وہ سلمان قلی خاں ودادؔ اور کے مشہور شاعر شاہ حاتم کے شاگرد ہوگئے۔ اردوشاعری میں سودا کو اتنی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی کہ لوگ انھیں 'ملک الشعرا' کہنے لگے۔ حالانکہ یہ ایسا خطاب تھا جو بادشاہ یا کوئی بہت بڑا آدمی کسی شاعر کو دیا کرتا تھا۔

نادرشاہ اور پھر احمد شاہ ابدالی کے لگاتار حملوں نے دہلی کو ایسا تباہ وبرباد کردیا تھا کہ اہلِ ہنر اپنے سرپرستوں اور ملازمت کی تلاش میں دہلی چھوڑکر دربدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوگئے۔ خانِ آرزوؔ، میرتقی میرؔ، سوداؔ، قیام الدین قائمؔ، قلندر بخش جراتؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، انشااللہ خاں انشاؔ، سعادت یارخاں رنگینؔ وغیرہ کو حالات سے مجبور ہوکر دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔

۱۷۶۰ء کے آس پاس سودا بھی ترکِ وطن پر مجبور ہوکر فرخ آباد میں، نواب احمد بخش خاں بنگش کے دیوان نواب مہرباں خاں رند کی سرکار سے منسلک ہوگئے۔ سودا فرخ آباد میں کئی سال رہے۔ نواب شجاع الدولہ کی دعوت پر وہ فیض آباد گئے۔ اس زمانے میں فیض آباد، اودھ کی راج دھانی تھی۔ جنوری ۱۷۷۵ء میں جب شجاع الدولہ کا انتقال ہوگیا تو ان کے فرزند آصف الدولہ جانشین ہوئے۔ آصف الدولہ نے اودھ کی راگ دھانی فیض آباد سے لکھنو منتقل کردی۔ حلات سے مجبور ہوکر سودا کو بھی لکھنو آنا پڑا۔

دہلی سے نکل کر سودا جہاں کہیں رہے، ان کی مالی حالت اچھی رہی۔ فرخ آباد میں نواب مہرباں خاں رند کی سرپرستی میں سودا کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ سودا کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ آخری عمر تک ان کے پاس اچھی نسل کے کئی کتے

تھے۔ جب سودا فیض آباد پہنچے تو نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ نے وظیفہ جاری رکھا جو وفات کے وقت تک انھیں ملتا رہا۔لکھنو میں نواب آصف الدولہ کے عہد کا ایک محلہ ہے 'جنگلی گنج'۔ اس محلے میں ایک مسجد ہے جو کسی زمانے میں مرزا سودا کی مسجد کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اب اس کا نام 'مسجدِ رحمانی' ہے۔ غالباً اسی مسجد سے ملے وہ مکانات تھے، جن میں سودا رہتے تھے۔ ۲۶/جون ۱۷۸۱ء کو سودا اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سودا اعزا خانہ آغا باقر میں دفن ہوئے تھے۔ سودا کی قبر زمین میں دب گئی تھی۔ ۱۸۶۹ء میں قبر زمین سے نکل کر اس کی مرمت کرائی گئی۔ قبر کے چاروں طرف ایک دیوار بنادی گئی۔ اب یہ قبر محفوظ ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ سودا کے آباواجداد کہاں سے ہندوستان آئے تھے؟

۲۔ سودا کے والد کا پیشہ کیا تھا؟

۳۔ سودا کی ولادت کب ہوئی؟

۴۔ سودا اردو شعر گوئی کی طرف کیسے مائل ہوئے؟

۵۔ سودا فرخ آباد میں کس نواب کے دربار سے منسلک ہوئے؟

6.4.2 سودا کی غزل گوئی

اس میں کوئی شک نہیں کہ سودا ایک بڑے شاعر تھے اگر چہ یہ بات بھی درست ہے کہ ان کی عظمت ان کی قصیدہ گوئی کی وجہ سے ہے لیکن یہ سمجھنا بھی خام خیالی ہوگی کہ ان کی غزلیں کم زور ہیں یا وہ اچھے غزل گو نہیں تھے، دراصل سودا ایک مخصوص لب و لہجے کے شاعر تھے چوں کہ سودا مزاجاً شوخ اور بہ قول خلیق انجم طرارے بھرتی ہوئی ہمہ رنگ طبیعت کے مالک تھے اس لیے قصیدے کی صنف ان کے لیے نہایت موزوں تھی اور یہ واقعہ بھی ہے کہ قصیدہ نگاری میں کم از کم سودا کا دور دور تک کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ سودا کی غزل گوئی پر زیادہ گفتگو اس لیے بھی نہ ہو سکی کہ اکثر ان کا موازنہ میر تقی میر کے ساتھ کیا گیا ظاہر ہے میر تو بالکل الگ طرح کے شاعر تھے۔ میر کی غزلوں میں جو معیاری شان ہے وہ سودا کے یہاں نہیں ہے چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ سودا کی غزل گوئی پس پشت چلی گئی اور جو گفتگو ہوئی بھی تو اسی موازنے کے دائرے کے اندر ہوئی۔

سودا وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے اندر داخلیت کے بجائے خارجیت کا رنگ ڈالا سودا نے غزل کو جو

خارجی رنگ دیا اس کے اثرات بعد کے شعرا پر پڑے۔سودا کے یہاں جوزور بیان، معنی آفرینی، بیان میں ندرت اور جوش وخروش ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔سودا کو زبان پر پورا عبور حاصل ہے انھوں نے سینکڑوں ہندی اور فارسی محاورے اردو زبان میں داخل کئے،سودا الفاظ کو بڑی برجستگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔محمد حسین آزاد نے سودا کے اسی بیان کی قدرت کے بارے میں لکھا ہے کہ :

''چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام ان (سودا) کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست وگریباں ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی۔''

سودا کے اسی خارجی نقطۂ نظر کی وجہ سے وہ شعر سے ظاہری حسن پر بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں،لفظوں کا انتخاب ، بندش، تراکیب اور تشبیہوں میں ندرت وغیرہ ایسے اوزار ہیں جن کی مدد سے ان کے شعروں کی بنت بہت عمدہ ہوتی ہے تاہم ایک کمی جو ان کی غزلوں میں کھٹکتی ہے وہ ہے سوز وگداز، یہ سوز وگداز دراصل داخلی عناصر سے پیدا ہوتا ہے جب تک کوئی تجربہ یا مشاہدہ شاعر کے اندر اتر کر تپتا نہیں ہے تب تک بات بنتی ہوئی نظر نہیں آتی، چوں کہ سودا کے یہاں خارجیت کا رنگ انتہائی نمایاں ہے اس لیے ان کی غزلوں میں سوز وگداز کی کمی ہے دوسری بات یہ بھی ہے کہ غزل کا مزاج بھی دروں بینی والا ہے۔

غزل ایک ایسی صنف ہے جس نے اپنی آنکھیں عشق کی گود میں کھولیں۔اب جہاں تک سودا کی غزلوں میں عشقیہ مضامین کا سوال ہے تو سوداؔ کے یہاں عشق کے مضامین زیادہ تر روایتی اور رسمی ہیں ان کے عشق میں نہ گرمی ہے اور نہ ہی وہ تڑپ جو عشق کو مادی کثافت سے نکال کر ماورائیت کی طرف لے جاتا ہے۔مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیں

ناصحا اس عشق سے ہوتا ہے لذت یاب دل
جس میں حرمت کم ہو رسوائی و خواری بیشتر

یا

سودا ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا
سنتا ہے اے دیوانے جب دل دیا تو پھر کیا

ان دونوں اشعار میں عشق کا کوئی بڑا تصور موجود نہیں ہے اور نہ ہی عشق میں رسوائی اور خواری کا دل کش بیان،رسوائی عشق میں ایک مثبت قدر کی حیثیت رکھتی ہے سودا کے اشعار میں ایک سپاٹ قسم کا بیان ہے کہ اس عشق میں لذت زیادہ ہوتی ہے جس میں رسوائی اور خواری زیادہ ہو۔تاہم کچھ ایسے اشعار بھی سودا کے یہاں مل جاتے ہیں جن میں

وہ ماورائیت کی طرف سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً

کیوں مجھ کو نہ مارا غمِ دوری نے ترے آہ
کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہارِ محبت

کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

کہتے ہیں جسے عشق سو وہ چیز ہے سودا
جو ں ذات ِ خدا جس کی حسب ہے نہ نسب ہے

سودا کے یہاں محبوب کا کوئی مکمل اور جامع تصور نہیں ہے اگر چہ انھوں نے محبوب کے خدوخال اور اس کے صفات کی تعریف ضرور کی ہے لیکن ایسے مضامین اور محبوب کے خوب صورتی کے تمام معیار ایک طرح سے مانگے ہوئے یا ادھار لیے ہوئے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ خود سودا کے ذہن میں کوئی حسین تصویر موجود نہ تھی لہذا محبوب کی انفرادیت ان کے یہاں ابھرنے نہیں پاتی ہے۔اسی لیے ان کے ایسے اشعار ہماری جمالیاتی حس کو متحرک کرنے میں نا کام رہتے ہیں البتہ ان مضامیں کے باندھنے میں ان کی قادرالکلامی ضرور جھلکتی ہے، یہ کہنا بھی بالکل بجا ہے کہ غزل کی رگوں میں تصوف خون کی طرح گردش کرتا ہے اس حوالے سے اگر سودا کی غزلوں کو دیکھا جائے تو یہاں تصوف کا گہرا رنگ البہ ضرور دکھائی دیتا ہے مثلاً

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوِطور کا

یعنی دیکھنے والی وہی ہے جو قطرے میں دریا اور ذرے میں صحرا کا مشاہدہ کرے،سودا مذہب کی ظاہری رسومات کے بھی خلاف ہیں یعنی ایسی رسمیں جو انسانوں کے درمیان تفریق پیدا کرتی ہیں سودا کے نزدیک اصل چیز دلی اور انسانی ہمدردی ہے مسجد و مدرسہ، دیر وحرم تو فرق ڈالنے والی چیزیں ہیں بلکہ دل کی حقیقت کو جاننا اور سمجھنا چاہیے۔

دیر وحرم کو دیکھا اللہ رے فضولی　　　　یہ کیا ضرور تھا جب دل کا مکاں بنایا

یا

کعبۂ دل کی حقیقت کو پہنچ اے شیخن　　　　خانقاہ و مدرسہ تیرا ٹھکانہ ہے عبث

سودا کے یہاں انسانی عظمت کا تصور جو آیا ہے وہ تصوف کے حوالے سے ہی آیا ہے جیسا کہ تصوف کی بنیادی تعلیمات میں سے یہ ہے کہ خدا کو تلاش کرنا ہے تو انسانوں ہی میں تلاش کرو اور خدا کے بندوں کے دکھ، درد، مسائل و مصائب کو دور کرنے کے جتن کرو یہی اصل خدا پرستی ہے۔ سودا کہتے ہیں۔

شیخ کعبے میں خدا کو تو عبث ڈھونڈے ہے　　　　طالب اس کا ہے تو ہر ایک کی کر دل جوئی

اسی طرح دنیا کی بے ثباتی کا مضمون بھی غزلوں کے اہم مضامین میں سے ایک رہا ہے اس ضمن میں کہتے ہیں

رخصت ہے باغباں کہ ٹک دیکھ لیں چمن　　　　جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

سودا کے یہاں مضامین چاہے جو ہوں وہ اسے اپنے زورِ بیان سے دل کش بنانے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں اور یہی سودا کا امتیاز ہے جس کی وجہ سے ان کی غزلیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔　سودا کے آباو اجداد کہاں سے ہندوستان آئے تھے؟

۲۔　سودا کی ولادت کب ہوئی؟

۳۔　سودا اردو شعر گوئی کی طرف کیسے مائل ہوئے؟

۴۔　سودا کو ملک الشعرا کیوں کہا جاتا ہے؟

۵۔　سودا کی غزلوں میں کون سا رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے؟

۶۔　سودا کی غزلوں میں سوز و گداز کی کمی کن اسباب سے ہے؟

۷۔　دنیا کی بے ثباتی پر سودا کا کوئی شعر قلم بند کیجیے۔

6.5 خواجہ میر درد

6.5.1 خواجہ میر درد کے حالات زندگی

خواجہ میر درد کے والدین کا تعلق سادات گھرانے سے تھا۔ ددھیال اور ننھیال دونوں خاندانوں میں کئی اہم بزرگ گزرے ہیں۔ خواجہ میر درد کے پردادا خواجہ محمد طاہر اورنگ زیب کے زمانے میں بخارا سے دہلی آئے، چوں کہ اورنگ زیب علما اور بزرگوں کے قدردان تھے چنانچہ پردادا کو بڑی عزت دی گئی اور ان کے بیٹوں کو اعلیٰ عہدوں سے نوازا گیا۔ میر درد کے والد کا نام خواجہ ناصر تھا اور عندلیب تخلص، خواجہ میر درد ۱۷۲۰ء میں پیدا ہوئے، انھوں نے اپنے والد سے علم قرآن، علم حدیث، تفسیر، فقہ اور تصوف کی تعلیمات حاصل کیں اس کے علاوہ خان سراج الدین آرزو سے بھی علم سیکھا انھیں موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس اس وقت کے بڑے بڑے موسیقار ان سے فنِ موسیقی کی تعلیم سیکھنے آتے تھے۔ حالاں کہ میر درد موسیقی کو مذہبی نقطۂ نظر سے اچھا خیال نہیں کرتے تھے، انھوں نے اپنی کتاب 'نالۂ درد' میں لکھا ہے کہ :

> ''میں اپنے بزرگوں کے طریقے کو صحیح سمجھتا ہوں اور موسیقی کو عبادت یا اچھی چیز نہیں خیال کرتا مگر میں اپنے شوق سے مجبور ہوں اور اس کو اللہ کی جانب سے سمجھتا ہوں ۔خدا گواہ ہے کہ میں کبھی گانے والوں کو بلاتا نہیں وہ لوگ خود آتے ہیں اور جب تک جی چاہتا ہے گاتے ہیں۔''

ابتدا میں درد نے بادشاہ شاہ عالم کی فوج میں نوکری کی اور سپاہی پیشہ اختیار کیا لیکن اس پیشے کے لیے جو حاکمانہ انداز اور جاہ وجلال درکار ہے وہ درد کے مزاج میں بالکل بھی نہ تھا وہ تو درویش اور گوشہ نشیں قسم کے آدمی تھے لہذا کچھ عرصے بعد یہ نوکری چھوڑ دی۔ درد کے والد خواجہ ناصر کو یہ اندازہ تھا کہ یہ پیشہ واقعی میں ان کے بیٹے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ درد نے باپ کی فقیری اور درویشی کو قبول کیا انتیس برس کی عمر میں انھوں نے درویشی اختیار کی اور اپنی پوری زندگی خدا کی یاد اور اس کے بندوں کو راہِ ہدایت دکھانے میں وقف کر دی۔

خواجہ میر درد غیر معمولی خوبیوں کے مالک تھے۔ باپ سے ورثے میں جو فقر و درویشی ملی تھی نیز ان کے خاندان میں مذہب اور انسانی ہمدردی کا جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا وہ درد میں بھی موجود تھا۔ ان کی طبیعت میں خوفِ خدا، مذہب کی پابندی، رحم، ہمدردی، بے نیازی تھی ان کی شخصیت کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کے جتنے بھی تذکرہ نگار گزرے ہیں سبھی نے ان کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے کسی بھی تذکرہ نگار نے ان کی کسی کمزوری اور برائی کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا اس سے ان کی بزرگی اور عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میر تقی میرؔ نے بھی

اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کچھ یوں کیا ہے :

'' وہ (خواجہ میر درد) بزرگ ہیں اور بزرگ کے بیٹے ہیں ۔جوان صالح ہیں۔درویشی میں انھیں بہت بڑا درجہ حاصل ہے، مجھ فقیر کو ان کا خاص قرب اور عقیدت حاصل ہے ویسے ان کا حسن سلوک ہر ایک کے لیے عام ہے۔انھوں نے دنیاوی عزت کی خواہش کو دل سے نکال دیا ہے۔''

خواجہ میر درد اپنے اصولوں کی خاطر بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کی محفل میں ایک مرتبہ بادشاہ شاہ عالم شریک تھے اور جیسا کہ اس طرح کی محفلوں میں بیٹھنے کا قاعدہ ہے کہ لوگ دوزانو ہو کر بیٹھتے ہیں۔بادشاہ نے پیر سیدھے کر لیے یہ دیکھ کر میر درد نے اعتراض کیا کہ فقیروں کی محفل میں اس طرح نہیں بیٹھا جاتا ،شاہ عالم نے پیر کی تکلیف کا عذر کیا جس پر میر درد نے کہا کہ جب طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو آنے کی کیا ضرورت تھی۔تحقیقی اعتبار سے اس بات میں سچائی ہو یا نہ ہو لیکن یہ طے ہے کہ درد بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔

اس زمانے میں شعرا بادشاہوں کے دربار سے منسلک ہوتے تھے اور شاہوں کی تعریف میں قصائد لکھا کرتے تھے جس کے عوض انعام واکرام ملا کرتا تھا اس زمانے میں درد وہ واحد شاعر تھے جو کسی کے دربار سے وابستہ نہیں تھے اور نہ انھوں نے کبھی کوئی قصیدہ امرا، وزرا یا بادشاہ کی شان میں لکھا۔کسی سے مدد مانگنا ان کی تعلیمات اور مزاج کے خلاف تھا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر ان کو اور ان کے گھر والوں کو فاقہ کرنا پڑتا تھا لیکن خودداری کا سودا کبھی نہیں کیا۔

خواجہ میر درد کا زمانہ انتہائی پر آشوب رہا۔دہلی پر ہمیشہ حملے ہوا کرتے تھے، سیاسی اور معاشی استحکام نہ تھا حالات کی خرابی کے سبب بہت سے شعرا نے دہلی کو چھوڑ کر لکھنو میں پناہ لی لیکن میر درد نے ایسا نہیں کیا وہ دہلی میں ہی رہے ان کا یہ ایمان تھا کہ خدا مہربان ہو تو اپنے بندے کو آگ سے سلامت نکال لیتا ہے اور نامہربان ہو تو بندہ کہیں بھی چلا جائے اس کی حفاظت کوئی نہیں کر سکتا ان کا دل ہمیشہ خوفِ خدا سے بھرا رہا اپنے ایک شعر میں انھوں نے اس جانب اشارہ بھی کیا ہے۔

کیا کام مجھے خوف و رجا سے کہ مرے پاس　　　ہے جان سو بے جان، دل ہے سو غنی ہے

آخر ۱۷۸۵ء میں دہلی میں اس درویش اور صوفی شاعر کا انتقال ہوا۔ان کا مزار ترکمان دروازے کے سامنے ہے وہیں ان کے والد کا بھی مزار ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ خواجہ میر درد کے بزرگ کس بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے؟

۲۔ میر درد کب پیدا ہوئے؟

۳۔ میر درد کے والد کا کیا نام تھا؟

۴۔ میر درد نے فوج کی نوکری کیوں چھوڑ دی؟

۵۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں میر درد کا ذکر کس طرح کیا ہے؟

۶۔ درد کا انتقال کب ہوا؟

6.5.2 میر درد کی غزل گوئی

خواجہ میر درد کا شمار اردو غزل کے بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ان کے بارے میں یہ رائے بہت مشہور ہے کہ انھوں نے صوفیانہ فکر کو اپنی شاعری کا مرکز ومحور بنایا ہے اس میں کوئی دو رائے بھی نہیں ہے اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ خود میر درد عملی طور پر صوفی رہے ہیں ان کی زندگی کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ درویشی اور فقر میں گزارا اور اسی لیے ان کے کلام میں اس کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔لیکن انھیں صرف صوفی شاعر کہہ دینے سے ان کی عظمت قایم نہیں ہو جاتی دراصل ہوا یہ کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے انھیں صوفی شاعر کہہ کر ان کے کلام میں سے متصوفانہ اشعار کا انتخاب کر کے سامنے رکھ دیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ درد کے کلام میں متصوفانہ اشعار کی تعداد ان کے بہت سے ہم عصر شاعروں خاص طور پر میرؔ کے متصوفانہ اشعار سے کم ہی ہے۔ بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے اس لیے اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ان کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی غزلیں سادگی سے بھری ہوئی ہیں۔جس طرح انھوں نے اپنی زندگی سادہ گزاری ان کا کلام بھی سادہ اور صاف ہے۔تصنع اور بناوٹ سے پاک ان کے شعر پہلی ہی نظر میں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔مثلاً یہ اشعار:

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری　　جی میں یہ کس کا تصور آگیا

ان اشعار کے مضامین پر غور کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں خدا کے یکتا اور واحد ہونے نیز اس کے ہر جگہ موجود ہونے کے صوفیانہ،فلسفیانہ اور پیچیدہ خیال کو خواجہ میر درد نے کتنے صاف اور آسان لفظوں میں ادا کیا ہے اور یہی میر درد کا امتیاز ہے۔تصوف کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک یہ ہے کہ وجود ایک ہی ہے یعنی خدا کا اور باقی تمام چیزیں ہمیں جو نظر

آتی ہیں وہ دراصل اسی کا عکس یا پرتو ہے جو نظر اشیا کے اختلافات میں کھو جاتی ہے وہ حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی یعنی آسان لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فلاں چیز ہے یہ فلاں اور ان کی بناوٹ، ان کی ماہیت الگ الگ ہے تو ایسی صورت حال میں ہم خدا تک نہیں پہنچ سکتے اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اشیا کے اختلاف کو مٹا دیں ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔

ہم آئینے کے سامنے جب آ کے ہو کریں　　　مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں

دہلی کی بربادی کی داستان سے آپ سبھی واقف ہیں کہ کبھی نادر شاہ درانی کا حملہ، کبھی احمد شاہ ابدالی کا، کبھی مرہٹوں کا تو کبھی جاٹوں کا، غرض دلی کبھی پر امن نہیں رہی آئے دن نت نئے ہنگامے برپا ہوا کرتے تھے ایسے میں پر امن اور اطمینان بخش زندگی نہیں گزاری جا سکتی یہی وجہ ہے کہ دلی کے بہت سے شعرا نے لکھنو کی راہ لی جو سیاسی اعتبار سے پر امن تھا لیکن میر درد کی درویشانہ طبیعت نے انھیں دلی ہی میں رکھا وہ ان ہنگاموں کو دیکھتے رہے ایسی صورت میں غم کا پیدا ہونا فطری بات ہے یہ درد یہ کرب ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔

منہ پہ ہے مہر خامشی، دل میں بھرا خروش ہے　　　آہ کہیں یہ ناتواں حال کرے سو کیا بیاں

یا

وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا　　　جلتا ہے اب پڑا خس و خاشاک میں ملا

ان اشعار میں خواجہ میر درد کے رنج و غم کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ وہ لٹنے، برباد ہونے کا تماشا دیکھتے رہے وہ لوگ جو کبھی چمن کے چراغ یعنی عزت و دولت والے تھے جو دہلی کے لیے باعث فخر تھے وہ خاک میں پڑے ہوئے ہیں، برباد ہو گئے ہیں۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں :

> ''درد کے اچھے اشعار میں ایک ہلکی سی کسک اور ایک طرح کی حسرت تہہ نشین معلوم ہوتی ہے جو تصوف کے بجائے اچھی عشقیہ اور اچھی جذباتی شاعری کی پہچان ہوا کرتی ہے ان کے یہاں اضطراب، تشنگی، بے اطمینانی اور کم یقینی کی ہلکی ہلکی جھلکیاں دکھائی دے جاتی ہیں ان کے اشعار میں حسرت و حیرت کا جو ملا جلا عالم ہے وہ سالک کی کیفیت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا وہ ایک ایسے شخص کی حیرت و حسرت ہے جس کے دل کا غنچہ کھلتے کھلتے رہ گیا۔''

عشقیہ مضامین غزل کے لیے لازم رہے ہیں پھر وہ فارسی غزل ہو یا اردو غزل، بڑے سے بڑے خیالات بھی عشق کے پیرایے میں بیان کیے گئے ہیں۔ عام طور پر ہمارے یہاں عشق کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک عشق حقیقی

اور دوسرے عشق مجازی۔ حقیقی عشق سے مراد خدا سے عشق، چوں کہ ہماری شاعری پر تصوف کے اثرات بہت نمایاں اور واضح رہے ہیں اس لیے بیشتر شعرا نے خدا کو محبوب مان کر اپنا مخاطب بنایا دوسری طرف ایک محبوب جس کا اپنا دنیاوی وجود ہے جو حسن میں اپنی مثال آپ ہے اس سے عشق کرنا مجازی کہلایا، درد کے یہاں دونوں طرح کے عشق دکھائی دیے ہیں لیکن جو حاوی عشق ہے وہ عشق حقیقی ہے چوں کہ وہ سرتاپا خدا کی محبت میں سرشار اور ڈوبے ہوئے تھے اس لیے اس موضوع پر بہت دل کش اور عمدہ اشعار کہے ہیں۔ چوں کہ خدا کا حسن آنکھوں سے اوجھل ہے اور ہم اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے دل کے آئینے کو صاف کرنا ضروری ہے اسی طرح خدا کی ذات اکبر ہے وہ لامتناہی ہے اس لیے زمین اور آسمان میں اس کی سمائی ممکن نہیں اس کی سمائی دل میں ہی ممکن ہے میر درد کا بڑا مشہور شعر ہے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے　　　میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

یا

مرا تو جی وہیں رہتا ہے نت جہاں ہے تو　　　اگر چہ میں یہ نہیں جانتا، کہاں ہے تو

عشق مجازی کے جتنے بھی پہلو ہیں وہ بھی میر درد کے یہاں ہمیں دکھائی دیتے ہیں مثلاً ایک کیفیت تو یہ ہے کہ محبوب کا سامنا ہوتے ہی دل پر جو عجیب وغریب کیفیت ہوتی ہے اس کا بیان، عشق کے بنیادی لازمے میں یہ بھی ہے کہ عاشق مضطرب اور بے چین پھرتا ہے غرض اس طرح کے مضامین درد کے یہاں بہ آسانی ملتے ہیں اور بڑی خوب صورتی اور صفائی کے ساتھ مثلاً :

وہ نگاہیں جو چار ہوتی ہیں　　　برچھیاں ہیں کہ پار ہوتی ہیں
پی گئی کتنوں کا لوہو تیری یاد　　　غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا
اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں　　　ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

خلیل الرحمان اعظمی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''اپنی صوفیانہ شاعری کے علاوہ خواجہ میر درد اپنی عشقیہ شاعری میں بھی اردو کے غزل گو شعرا میں منفرد ہیں ان کی اس حیثیت میں سوائے میرؔ کے ان کا اور کوئی حریف نہیں۔''

خلیل الرحمان اعظمی کے اس تبصرے سے یہ بات صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ درد کے یہاں عشقیہ مضامین کو برتنے

کا سلیقہ اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے جس طرح میر عشق اور اس کے لوازمات کو بڑی آسانی اور صفائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کم و بیش یہی پیرایہ درد کے یہاں بھی ہمیں دکھائی دیتا ہے۔غرض موضوع خواہ کوئی ہو درد اپنی بات کو اتنی آسانی اور صفائی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کی ہر بات دل میں اتر جاتی ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی شاعرانہ خوبی ہے۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

۱۔ میر درد کے یہاں صوفیانہ فکر کی کثرت کیوں پائی جاتی ہے؟

۲۔ رشید حسن خاں نے درد کی شاعری پر کیا لکھا ہے؟

۳۔ خلیل الرحمان اعظمی نے درد کی عشقیہ شاعری پر کیا تبصرہ کیا ہے؟

۴۔ میر درد کی غزل گوئی کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟

6.6 میر تقی میر

6.6.1 میر تقی میر کی حالات زندگی

میر تقی میر ۲۰ رستمبر ۱۷۲۲ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔میر کے بزرگ روزگار کی تلاش میں حجاز سے دکن آ گئے تھے میر کے پردادا اکبر آباد گئے جو اس زمانے میں مغلیہ حکومت کا مرکز تھا۔میر کے دادا کا تعلق اسی خاندان سے تھا جنھیں فوج میں ملازمت مل گئی تھی۔میر کے دادا محض پچاس برس کی عمر میں ہی وفات پا گئے۔ان کے دو بیٹے تھے۔بڑے بیٹے کو پاگل پن کا عارضہ لاحق تھا اور وہ کم عمری ہی میں فوت ہو گئے، چھوٹے بیٹے کا نام محمد علی تھا۔محمد علی اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر علی متقی کے خطاب سے موسوم ہوئے۔علی متقی میر کے والد تھے۔انھوں نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی سراج الدین آرزو کی بڑی بہن تھیں جن کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام حافظ محمد حسن تھا دوسری بیوی سے علی متقی کے ہاں تین اولادیں ہوئیں۔دولڑکے محمد تقی اور محمد رضی اور ایک بیٹی جو بڑی ہو کر محمد حسین کلیم کو بیاہی گئیں۔علی متقی کے بڑے بیٹے محمد تقی ہی اردو غزل کے عظیم شاعر میر تقی میرؔ ہیں۔میر کے والد علی متقی ایک درویش تھے میر نے اپنی خود نوشت ''ذکر میر'' میں اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ

''وہ ایک صالح عاشق پیشہ شخص تھے، گرم دل کے مالک، شب زندہ دار اور روزِ حیران کار''

میر اپنے والد کی شخصیت اور صحبت سے بے حد متاثر تھے۔ذکرِ میر ہی میں میر نے لکھا ہے کہ ان کے والد ان سے کہا کرتے

تھے کہ ''اے بیٹے عشق اختیار کر، کیوں کہ عشق کے بغیر زندگی وبال ہے، دنیا میں جو کچھ ہے، عشق کا مظہر ہے۔'' مگر بدقسمتی سے میر کی عمر ابھی گیارہ برس ہی کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کی وفات کے بعد ان کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے ان سے برا سلوک کیا یہاں تک کہ باپ سے ترکے میں ملنے والی تین سو کتابوں میں سے ایک کتاب بھی میر کو نہ دی۔ اس کم عمری میں میر کو اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی اور چھوٹی بہن کا پیٹ بھرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ میر آگرہ اور اس کے اطراف میں روزگار تلاش کرنے لگے لیکن ناکامی ہاتھ لگی مجبوراً تلاش معاش کی غرض سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے یہاں ان کی ملاقات خواجہ محمد باسط سے ہوگئی انھوں نے ترس کھا کر انھیں اپنے چچا صمصام الدولہ کی خدمت میں لے گئے ۔صمصام الدولہ میر کے والد سے بے حد عقیدت رکھتے تھے چنانچہ یہ کہہ کر کہ ان کے مجھ پر حقوق ہیں، ایک روپیہ یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ میر دہلی سے واپس آگرہ آ گئے اور اسی ایک روپیہ یومیہ پر اپنے چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کے ساتھ گزر بسر کرنے لگے لیکن پانچ سال بعد یہ وظیفہ منقطع ہوگیا کیوں کہ صمصام الدولہ جنگ میں زخمی ہو کر فوت ہو گئے تھے ۔میر پھر بے یار و مددگار ہو گئے ناچار دوبارہ میر نے دہلی کا رخ کیا۔

دہلی پہنچ کر میر تقی میر نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین خان آرزو کے یہاں قیام کیا۔ خان آرزو اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ قسمت کی خرابی کہ دہلی پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ہی میر پر جنون کا دورہ پڑا جوان کا خاندانی مرض تھا اس مرض سے نجات پانے میں تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا۔ میر خان آرزو کے ہاں سات برسوں تک مقیم رہے اور کھانے پینے کے علاوہ تعلیم و تربیت کے بھی مراحل سے گزرتے رہے لیکن بعد میں خان آرزو میر کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آنے لگے۔ میر نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ انھیں حافظ محمد حسن نے ورغلایا تھا۔ خان آرزو کے اس رویے سے تنگ آ کر میر نے ان کے یہاں سکونت ترک کر دی اور حوض قاضی چلے گئے وہاں رعایت خاں نے جو مالوہ کے صوبے دار کے بیٹے تھے میر کو اپنا مصاحب مقرر کر لیا اس طرح میر کو بے روزگاری سے نجات ملی ۔۱۷۴۹ء میں میر نے رعایت خاں کی مصاحبت ترک کر دی اور پھر نواب بہادر جاوید خاں کی ملازمت اختیار کی صفدر جنگ نے جاوید خاں سے ناراض ہو کر اسے قتل کرا دیا تو میر ایک بار پھر بے روزگار ہو گئے ۔صفدر جنگ کو میر کی مشکلات کا اندازہ تھا چنانچہ اس نے میر کو اپنے پاس بلا یا میر کے کچھ دن فراغت سے گزرے۔ اکتوبر ۱۷۵۴ء میں صفدر جنگ کا انتقال ہو گیا، میر پھر بے سہارا ہو گئے ،بعد ازاں میر کی رسائی مہاراجہ ناگرمل تک ہوگئی انھوں نے میر کو ملازم رکھ لیا۔ میر یہاں ایک برس تک ہی اطمینان اور سکون کے ساتھ رہنے پائے تھے کہ احمد شاہ ابدالی نے ایک مرتبہ پھر دہلی پر یلغار کی اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ میر 'ذکر میر' میں لکھتے ہیں:

''میں کہ فقیر تھا اور فقیر ہو گیا۔ میرا حال بے اسبابی اور تہی دستی کی وجہ سے ابتر ہو گیا

شاہراہ پر جو میرا جھونپڑا تھا، مسمار ہو گیا۔''

غرض دہلی میں رہتے ہوئے میر نے بڑے تنگ حالات کا سامنا کیا مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کبھی یہاں تو کبھی وہاں در در کی ٹھوکریں کھاتے رہے آخر کار وہ دہلی چھوڑ کر لکھنو چلے گئے۔ لکھنو کی روانگی کے بارے میں خود لکھتے ہیں۔

''ان ایام میں فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن زادراہ سے مجبور تھا، میری عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ کے دل میں خیال آیا کہ میر پاس آئے تو اچھا ہے۔''

ان حالات کی روشنی میں صاف نظر آتا ہے کہ والد کی وفات کے بعد میر نے بڑی کسمپرسی میں گزر بسر کی، کبھی حالات بہتر بھی ہوئے تو اس کا وقفہ کم کم ہی رہا۔ میرؔ جب لکھنو آئے تو نواب آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہوئے اور نواب سے کافی قربت رہی۔ لکھنو میں میر اپنی زندگی کے اکتیس سال گزارے، آخر ۲۰ رستمبر ۱۸۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ میر تقی میر کب پیدا ہوئے؟

۲۔ میر کے والد کا کیا نام تھا؟

۳۔ ''ذکر میر'' میں میر نے اپنے والد کے بارے میں کیا لکھا ہے؟

۴۔ میرؔ کے والد میر سے کیا کہا کرتے تھے؟

۵۔ صمصام الدولہ نے میر کے لیے کتنا وظیفہ مقرر کیا تھا؟

۶۔ دہلی پہنچ کر میر نے کس کے یہاں قیام کیا؟

۷۔ میر کے سوتیلے ماموں کا کیا نام تھا؟

۸۔ صفدر جنگ کا انتقال کب ہوا؟

۹۔ لکھنو میں میر کس نواب کے دربار سے منسلک ہوئے؟

۱۰۔ میر کا انتقال کب ہوا؟

6.6.2 میر کی غزل گوئی

میر تقی میر نے اپنے بہت سے اشعار میں اپنی شعر گوئی کے متعلق بعض اہم باتیں کہی ہیں جنھیں تعلّی کہا جا سکتا ہے لیکن میر کے شعری قد کو دیکھتے ہوئے اس تعلّی میں صداقت کا کچھ رنگ بھی جھلکتا ہوا دکھائی دے گا۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز   تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

حشر تک دیوان باقی رہنے کے قصے کے علاوہ اس شعر میں جو باریک اور لطیف نکتہ انھوں نے اپنی شعر گوئی کے متعلق بیان کیا ہے وہ ہے شور انگیزی، عام طور پر ہمارے یہاں میر کی شاعری کو آہ اور سودا کی شاعری کو واہ کہنے کا غیر تنقیدی رویہ موجود ہے جس کی وجہ سے میر کے بعض شعری امتیازات نظروں سے اوجھل رہے اس شعر میں میر نے جس شور انگیزی کا ذکر کیا ہے اس پر ناقدین نے توجہ نہیں دی سوائے کچھ علمائے ادب کے، اسی طرح کی بات میر نے اپنے ایک شعر میں یوں بیان کی ہے۔

جدھر سے دیکھیے ایک شعر شور انگیز نکلے ہے   قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

میر کی شعری عظمت کا اعتراف ہر زمانے میں ہوا ہے۔ خود ان کے زمانے میں سودا نے کہا تھا کہ

سودا تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ   ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف

اسی طرح ناسخ جو کسی کو جلد خاطر میں نہیں لاتے تھے یہ کہا

شبہ ناسخ ہے کسے میر کی استادی کا   آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

اسی طرح غالب نے ناسخ کے مصرعے پر گرہ لگا کر میر کو یوں خراج تحسین پیش کیا کہ

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قول ناسخ   آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

غرض یہ کہ میر کی استادی اور عظمت کا اعتراف اس وقت بھی کیا گیا اور بعد میں بھی سبھی ناقدین ادب نے میر کی عظمت بیان کی ہے، ظاہر ہے اس کے کچھ اسباب بھی ہوں گے میر نے ایک جگہ کہا ہے

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے   ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ میر کی انفرادیت ہی یہی ہے کہ ان کی شاعری کا اسلوب مروجہ شعری اسلوب سے مختلف اور

متنوع ہے یعنی ان کی گفتگو کا ڈھب سب سے جداگانہ اور الگ ہے۔میر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بات بات میں یا یہ کہہ لیجیے کہ چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی باتوں میں معنی آفرینی کے کئی پہلو نکال لیتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ایک بار جب میر کا قیام ان کے ماموں خان آرزو کے ہاں تھا تو ایک دن خان آرزو نے مرزا محمد رفیع سودا کا یہ شعر پڑھا اور کہا آج مرزا یہ شعر نہایت مباہات سے پڑھ گئے ہیں

چمن میں صبح جو اس جنگ جو کا نام لیا　　　صبا نے تیغ کا آب رواں سے کام لیا

میر وہیں موجود تھے انھوں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　　دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

خان آرزو نے میر کا مطلع سننے کے بعد بے ساختہ کہا کہ ''خدا چشم بد سے محفوظ رکھے''۔

دونوں شعر کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ میر نے کس قدر سادگی کے ساتھ شعر کہا لیکن میر کی سادگی میں پرکاری ہے یعنی پڑھنے والے کو محسوس ہوگا کہ نہایت آسان اور سادہ شعر ہے لیکن جب اس پر غور کیا جائے اور لفظوں کے سلسلے یا نشست و برخاست پر معمولی توجہ کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر سادہ نظر آنے والی چیز اتنی سادہ نہیں ہے بلکہ اس میں معنی آفرینی کی ایک نئی دنیا آباد ہے۔

جہاں تک میر کی شاعری کے فکری عناصر کی بات ہے تو میر کی شاعری میں ایک ایسے عاشق پیشہ کا کردار ابھرتا ہے جو اسی زمین کا باشندہ ہے اور اس کا عشق بھی ارضی ہے یعنی میر کی اقلیم عشق میں کوئی افلاطونی یا نہایت فلسفیانہ رنگ کم نظر آتا ہے اور جہاں آتا بھی ہے تو جذبات کے دھارے میں بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ میرؔ کے اشعار ذہن اور دماغ سے زیادہ انسانی جذبات میں ہلچل پیدا کرتے ہیں اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے جو بہت کم شعرا کے حصے میں آئی ہے یعنی فکر کو جذبات کی ماتحتی میں دینا میر کا شیوۂ خاص ہے ورنہ عموماً فکر سے مملو اشعار قاری کو ذہنی جمناسٹک کرنے پر مجبور کردیتے ہیں۔مثال کے طور پر یہ شعر:

دیر تک شمع سر کو دھنتی رہی　　　کیا پتنگے نے التماس کیا

یا

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات　　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

پہلے شعر میں شمع اور پتنگے کا لفظ عاشق و معشوق کے استعارے ہیں ان استعاروں کی مدد سے میر نے ہلکا سا ابہام پیدا کر

کے ایک پرسوز کیفیت پیدا کی ہے دوسرا شعر زندگی کی بے ثباتی سے متعلق ہے لیکن کس قدر سادگی کے ساتھ اس مضمون کو میر نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ذہن سے زیادہ جذبات میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔اس بارے میں عبدالمغنی لکھتے ہیں ''جو افکار وخیالات ان (میرؔ) کی غزلوں میں روبہ اظہار آئے ہیں وہ ان کا شعری تجربہ بن کر خواہ استعاروں میں ملفوف ہوں یا واشگاف، ان تصورات سے ان کے جذبات وابستہ ہیں اور وہ ان کے احساسات میں سموئے ہوئے ہیں چنانچہ ان کا تفکر ان کی تخئیل کا ایک حصہ ہے اور اس لیے مصنوعی نہیں، فطری ہے۔انھوں نے اپنی تہذیب کی اعلیٰ اقدار کو اپنے ذہن وکردار میں جذب کیا ہے ان کا خارجی مشاہدہ ان کا باطنی مطالعہ بھی ہے۔'' اسی طرح عشق کے مضمون میں دیکھیے کس طرح میر نے انسانی ہمدردی کو غیر محسوس طریقے سے بیان کیا ہے۔

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا　　　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

عاشق کے رونے کے شور سے ہمسایے کی نیند میں خلل پڑنا ایک طرف جہاں عاشق کے کرب کو ظاہر کر رہا ہے تو وہیں دوسری طرف ہمسایے کے بیدار ہونے کے عمل میں ایک انسانی ہمدردی بھی پیدا کر رہا ہے جس سے عاشق بے خبر ہے ،عاشق کی بے خبری اس کے جنون کو بھی نشان زد کرتی ہے۔میر کے یہاں عشق کا مضمون بہت فراواں ہے۔

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد　　　　ایسے پھر خانماں خراب کہاں

میر چاہے جس موضوع کو برتیں وہ اس ڈھب سے بیان کر جاتے ہیں کہ جس کی نظیر اردو غزل کی تاریخ میں ملنا ممکن نہیں ۔میر نے اپنے عہد کے ظلم وجبر یا سیاسی، معاشی حالات کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے تو وہ اپنا ایک الگ نشتر رکھتے ہیں۔

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں　　　　نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا

یا

دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں　　　　تیرے کوچے میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا

اسی لیے میر نے ایک جگہ کہا ہے کہ

تھا بلا ہنگامہ آرا میرؔ بھی　　　　آج تک گلیوں میں اس کا شور ہے

میر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں آج بھی جاری ہیں اور یہ امر میرؔ کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۴۔میر تقی میر کب پیدا ہوئے؟

۵۔'ذکر میر' میں میر نے اپنے والد کے متعلق کیا لکھا ہے؟

۶۔میر اکبرآباد سے دہلی کیوں گئے؟

۷۔دہلی میں میر کا قیام ابتدا میں کس کے یہاں تھا؟

۸۔سوداؔ نے کس شعر کے ذریعے میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے؟

۹۔میر کی سب سے بڑی شاعرانہ خوبی کیا ہے؟

6.7 خلاصہ

سودا کی ولادت ۱۷۰۷ء میں ہوئی۔سودا نے دہلی میں پرورش پائی۔یہیں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی۔انھوں نے ان علوم کی تعلیم حاصل کی جوان کے زمانے میں رائج تھے۔ان کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی کا بہت اچھا مطالعہ کیا۔تھوڑی بہت عربی پڑھی تھی۔نادرشاہ اور پھر احمد شاہ ابدالی کے لگاتار حملوں نے دہلی کو ایسا تباہ وبرباد کردیا تھا کہ اہلِ ہنر اپنے سرپرستوں اور ملازمت کی تلاش میں دہلی چھوڑ کر دربدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوگئے۔خانِ آرزوؔ، میر تقی میرؔ، سوداؔ، قیام الدین قائمؔ، قلندر بخش جراتؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، انشااللہ خاں انشاؔ، سعادت یار خاں رنگینؔ، وغیرہ کو حالات سے مجبور ہوکر دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔۱۷۶۰ء کے آس پاس سودا بھی ترکِ وطن پر مجبور ہوکر فرخ آباد، فیض آباد اور لکھنؤ کا سفر کیا۔ ۲۶ رجون ۱۷۸۱ء کو سودا اللہ کو پیارے ہو گئے۔سودا وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے اندر داخلیت کے بجائے خارجیت کا رنگ ڈالا سودا نے غزل کو جو خارجی رنگ دیا اس کے اثرات بعد کے شعرا پر پڑے۔سودا کے یہاں جوزور بیان، معنی آفرینی، بیان میں ندرت اور جوش وخروش ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔سودا کو زبان پر پورا عبور حاصل ہے انھوں نے سینکڑوں ہندی اور فارسی محاورے اردو زبان میں داخل کئے،سودا الفاظ کو بڑی برجستگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

خواجہ میر درد ۱۷۲۰ء میں پیدا ہوئے،انھوں نے اپنے والد سے علم قرآن،علم حدیث،تفسیر،فقہ اور تصوف کی تعلیمات حاصل کیں اس کے علاوہ خان سراج الدین آرزو سے بھی علم سیکھا انھیں موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس اس وقت کے بڑے بڑے موسیقاران سے فنِ موسیقی کی تعلیم سیکھنے آتے تھے۔۱۷۸۵ء میں دہلی میں اس درویش اور صوفی شاعر کا انتقال ہوا۔خواجہ میر درد کا شمار اردو غزل کے بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ان کے بارے میں یہ

رائے بہت مشہور ہے کہ انھوں نے صوفیانہ فکر کو اپنی شاعری کا مرکز ومحور بنایا ہے اس میں کوئی دو رائے بھی نہیں ہے اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ خود میر درد عملی طور پر صوفی رہے ہیں ان کی زندگی کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ درویشی اور فقر میں گزارا اور اسی لیے ان کے کلام میں اس کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔ لیکن انھیں صرف صوفی شاعر کہہ دینے سے ان کی عظمت قایم نہیں ہو جاتی دراصل ہوا یہ کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے انھیں صوفی شاعر کہہ کر ان کے کلام میں سے متصوفانہ اشعار کا انتخاب کر کے سامنے رکھ دیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ درد کے کلام میں متصوفانہ اشعار کی تعداد ان کے بہت سے ہم عصر شاعروں خاص طور پر میرؔ کے متصوفانہ اشعار سے کم ہی ہے۔ بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے اس لیے اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی غزلیں سادگی سے بھری ہوئی ہیں۔ جس طرح انھوں نے اپنی زندگی سادہ گزاری ان کا کلام بھی سادہ اور صاف ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے پاک ان کے شعر پہلی ہی نظر میں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

میر تقی میر ۲۰ ر ستمبر ۱۷۲۲ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد میر نے بڑی کسمپرسی میں گزر بسر کی، کبھی حالات بہتر بھی ہوئے تو اس کا وقفہ کم کم ہی رہا۔ میرؔ جب لکھنو آئے تو نواب آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہوئے اور نواب سے کافی قربت رہی۔ لکھنو میں میر اپنی زندگی کے اکتیس سال گزارے، آخر ۲۰ ر ستمبر ۱۸۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ جہاں تک میر کی شاعری کے فکری عناصر کی بات ہے تو میر کی شاعری میں ایک ایسے عاشق پیشہ کا کردار ابھرتا ہے جو اسی زمین کا باشندہ ہے اور اس کا عشق بھی ارضی ہے یعنی میر کی اقلیم عشق میں کوئی افلاطونی یا نہایت فلسفیانہ رنگ کم نظر آتا ہے اور جہاں آتا بھی ہے تو جذبات کے دھارے میں بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے

6.8 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جوابات لکھیے۔

ا۔ دہلی میں میر کے حالات پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ سودا کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ میر کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیجیے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

ا۔ سودا کی غزل گوئی کا جائزہ لیجیے۔

۲۔ خواجہ میر درد کے حالات زندگی کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۳۔ میر درد کی غزل گوئی پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۴۔ میر کے حالات زندگی پر تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔

6.9 فرہنگ

عُذر	بہانہ، حیلہ
پرآشوب	فتنہ وفساد سے بھرا ہوا
رجا	خوف، ڈر
متصوفانہ	تصوف سے پُر، جس میں تصوف کے مضامین ہوں
شواہد	ثبوت
مبذول کرانا	توجہ دلانا
ریشہ دوانی	جوڑتوڑ، سازش
ندرت	نیاپن
دروں بینی	اپنی ذات کے اندر دیکھنا، خودآگاہی
جمالیاتی حس	انسان کے اندر پایا جانے والا حسن کی تحسین کا مادہ یا احساس
رمق	ذرا سا
پرآشوب	فساد سے بھرا ہوا
اینٹ سے اینٹ بجا دینا: (محاورہ)	مکمل طور پر برباد کر دینا
سکونت	رہنے کی جگہ، قیام
مصاحبت	ساتھ رہنا، ہم نشینی
یلغار	حملہ، دھاوا
تہی دستی	غریبی، مفلسی
دردر کی ٹھوکریں کھانا (محاورہ)	دنیا بھر میں ذلیل ہونا، مارا مارا پھرنا
تعلیٰ	شعر میں اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا

بے بہرا	محروم، بے نصیب، بے ادب
معتقد	اعتقاد رکھنے والا
مروجہ	رائج
معنی آفرینی	شعر میں ایک زیادہ معنی ہونا
مباہات	فخر، بڑائی
کسو	کسے
تیغ	تلوار

6.10 معاون کتابیں

۱۔ مرزا محمد رفیع سودا : پروفیسر نذیر احمد

۲۔ مرزا محمد رفیع سودا : ڈاکٹر خلیق انجم

۳۔ میر تقی میر : مظفر حنفی

۴۔ خواجہ میر درد مرتبہ ڈاکٹر رضا حیدر

☆☆☆

اکائی۔7 : مرزا غالبؔ، داغؔ دہلوی، شادؔ عظیم آبادی

ساخت :

7.1 تمہید

7.2 اغراض و مقاصد

7.3 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

7.3.1 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی حیات اور شخصیت

7.3.2 مرزا غالبؔ کی غزل گوئی

7.4 نواب مرزا داغؔ دہلوی

7.4.1 نواب مرزا داغؔ دہلوی کی حیات اور شخصیت

7.4.2 مرزا داغؔ کی غزل گوئی

7.5 شادؔ عظیم آبادی

7.5.1 شادؔ عظیم آبادی کی حیات اور شخصیت

7.5.2 شادؔ عظیم آبادی کی غزل گوئی

7.6 خلاصہ

7.7 نمونۂ امتحانی سوالات

7.8 فرہنگ

7.9 کتابیات

7.1 اغراض ومقاصد

اردو شاعری کی روایت میں مرزا غالبؔ، داغؔ دہلوی اور شادؔ عظیم آبادی تین مختلف جہانوں کے تخلیق کار ہیں۔مرزا غالبؔ کی شاعری کا لطف الگ مزاج چاہتا ہے، داغؔ دہلوی کی شاعری کے لیے طبیعت میں حد درجہ شوخی ضروری ہے اور شادؔ اپنے کلام کی تفہیم کے لیے مختلف مزاج کے متقاضی ہیں۔ان تینوں معتبر اور معروف شعرا کا مطالعہ نہ صرف ادبی طور پر طالب علم کو ثروت مند بنائے گا بلکہ مختلف ادوار اور مزاج کے شعرا کی تخلیقی شدت سے بھی متعارف کرے گا۔

7.2 تمہید

اس اکائی میں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، مرزا داغؔ دہلوی اور شادؔ عظیم آبادی کی حیات، شخصیت اور شاعری زیر غور ہیں۔تینوں شعرا اردو غزل کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنے اپنے فن میں معراج حاصل کیے ہوئے ہیں۔ اس اکائی میں نہ صرف ان کی زندگی کے بارے میں معلومات درج کی گئی ہے بلکہ ان کے کلام کی جھلکیاں بھی پیش کی گئیں ہیں۔یہ اکائی طالب علموں کو اردو کی شعری روایت میں غزل کے مختلف ذائقوں سے روشناس کرے گی۔

7.3 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

7.3.1 مرزا غالبؔ کی حیات اور شخصیت

مرزا غالبؔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا۔مرزا عبداللہ بیگ پیشہ سپہ گری سے وابستہ تھے۔لکھنو کے نواب آصف الدولہ، حیدرآباد کے نواب نظام علی خان بہادر اور آخر میں الور کے راجہ بختاور سنگھ کی افواج میں یکے بعد دیگرے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔راجہ بختاور سنگھ کی فوج میں رہتے ہوئے ایک لڑائی میں مرزا عبداللہ بیگ مارے گئے۔اس وقت مرزا غالب کی عمر بمشکل پانچ سال تھی۔مرزا عبداللہ بیگ کے بڑے بھائی مرزا نصراللہ بیگ تھے۔مرزا نصراللہ بیگ بھی فوج میں اعلیٰ مقام پر تعینات تھے۔ بھائی کی موت کے بعد مرزا نصراللہ نے ان کے خاندان کی کفالت کی۔ پہلے مراٹھوں کی آگرہ صوبیداری میں فوجی افسر تھے، انگریزوں کی عملداری کے بعد نصراللہ بیگ چارسو سواروں کے افسر بن گئے۔ماہانہ تنخواہ کے ساتھ خوب ساری جاگیریں بھی عطا ہوئیں۔مرزا غالبؔ کا بچپن باوجود اس کے کہ یتیمی کا دور تھا مگر خوش حال تھا۔تاہم نو برس کے تھے کہ چچا نصراللہ بیگ بھی کسی معرکہ میں کام آگئے۔

مرزا غالبؔ کی تاریخ پیدائش ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء ہے۔مرزا غالبؔ کا ایک چھوٹا بھائی مرزا یوسف تھا۔آخر میں دماغ میں خلل آگیا تھا اور اسی بیماری میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔مرزا غالبؔ کے چچا نصراللہ بیگ کی جاگیر دہلی کے نواب احمد بخش کے سپرد ہوئی اور انھیں سالانہ دس ہزار روپے نصراللہ بیگ کے پسماندگان کو ادا کرنے کا حکم ہوا۔مگر انھوں نے اس بھرے پرے خاندان کو سالانہ محض تین ہزار روپے ہی دیے جن میں سے مرزا غالبؔ کے حصے میں سات سو روپے سالانہ آتے تھے۔اس بے ایمانی کے خلاف مرزا غالبؔ نے انگریزی سرکار کے دارالسلطنت کلکتہ میں فریاد کی اور اپنا حق مانگنے کے لیے اپیل دائر کی۔۔مگر اس میں کامیابی نہیں مل پائی۔

مرزا غالبؔ کی شادی ۱۳ سال کی عمر میں امراؤ بیگم سے ہوئی تھی۔ان کی اولادیں بھی ہوئیں مگر ایام طفولیت ہی میں انتقال کر جاتی تھیں۔مرزا غالبؔ کے بھائی یوسف بیگ کی نسل ایک بیٹی سے چلی۔شادی کے بعد مرزا دہلی آگئے اور تادم آخر دہلی ہی میں رہے۔مرزا غالبؔ کو مرزا نوشہ کہا جاتا تھا۔ان میں شاعری کا مادہ قدرتی طور پر ودیعت کیا گیا تھا، انھیں اپنی فارسی شاعری زیادہ عزیز تھی۔شروع میں انھوں نے اسدؔ تخلص اختیار کیا تھا مگر ایک بار ان کے سامنے کسی غیر معروف شاعر جن کا تخلص بھی اتفاقاً اسدؔ تھا، کا یہ شعر سنایا گیا

اسدؔ تم نے بنائی یہ خوب غزل ؎ ارے او شیر! رحمت ہے خدا کی

شعر سن کر مرزا غالبؔ نے کہا ''اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت خدا کی ہو اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔''اس کے بعد اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا اور غالبؔ تخلص اختیار کیا۔تاہم اسدؔ تخلص والے اشعار میں تبدیلی نہیں کی۔مرزا غالبؔ نے اپنی شاعرانہ روش زمانے سے ہمیشہ جدا رکھی۔

دہلی کے نامور شعرا میں اور باکمال فارسی دانوں میں مرزا غالبؔ کا نام سرفہرست تھا۔قدیم دہلی کالج میں جس طرح عربی مدرس کا انتخاب عمل میں آیا ہوا تھا اسی طرح فارسی داں استاد کی بھی ضرورت محسوس کی گئی۔لیفٹننٹ گورنر رہے اس وقت کے سیکریٹری سر ٹامسن صاحب مدرس کا امتحان لینے کے لیے دہلی آئے۔لوگوں نے انھیں چند فارسی عالموں کے نام بتائے، جن میں مرزا غالبؔ، مومن خان مومنؔ، امام بخش صہبائی کے نام بھی شامل تھے، بلکہ سرفہرست تھے۔چنانچہ پہلے مرزا غالبؔ کو سندیسہ بھیجا گیا کہ فارسی زبان کی تدریس کی اسامی کے لیے سیکریٹری ٹامسن صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لائیے۔مرزا غالبؔ پالکی میں سوار ہو کر کالج کے گیٹ پر پہنچے اور پالکی سے اتر کر وہیں کھڑے رہے۔انتظار کرنے لگے کہ سیکریٹری صاحب ان کے استقبال کے لیے آئیں گے۔کافی دیر تک انتظار کرتے رہے۔دفتر میں سیکریٹری صاحب انتظار کر رہے تھے۔انھوں نے جمعدار سے پوچھا ''کیا مرزا غالبؔ آئے ہیں؟'' جمعدار نے کہا ''جی، آئے ہیں۔'' سیکریٹری صاحب نے کہا ''انھیں اندر بلاؤ۔'' جمعدار باہر آیا مرزا غالبؔ سے پوچھا '' آپ کیوں نہیں چلتے؟''

غالبؔ نے کہا'' صاحب استقبال کوتشریف نہیں لائے ۔میں کیوں کر جاتا؟'' جمعدار نے جا کر سیکریٹری صاحب تک یہ پیغام پہنچایا۔سیکریٹری صاحب باہر آئے اور مرزا غالبؔ سے کہا'' جب آپ دربار گورنری میں بہ حیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی تعظیم ہوگی۔لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں۔اس تعظیم کے مستحق نہیں۔'' مرزا غالبؔ نے کہا'' گورنمنٹ کی باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں، نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں۔'' سیکریٹری صاحب نے کہا'' ہم آئین سے مجبور ہیں۔'' مرزا غالبؔ رخصت ہوکر چلے آئے۔یہ ۱۸۴۲ء کا واقعہ ہے۔

مرزا غالبؔ نے کوئی ملازمت نہیں کی۔ بزرگوں کی رحمت ان کی وفات کے بعد بھی مرزا غالبؔ پر برستی رہی۔جاگیر کے بدلے میں روپیہ ملتا رہا۔پھر ۱۸۵۰ء کے بعد آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے حکم سے'' تاریخ تیموریہ'' لکھنے پر مامور ہوئے۔دربار سے وابستگی نے مرزا غالبؔ کی یافت میں اضافہ کیا۔ذوقؔ دہلوی کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر کیے گئے۔حالانکہ استادی کا یہ دور مختصر رہا اور جلد ہی ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا اور بادشاہت ختم ہوگئی۔اس واقعہ کا اثر مرزا غالبؔ کی زندگی پر بھی پڑا۔ دربار سے ہونے والی آمدنی ختم ہوگئی، انگریزوں کی پینشن متروک ہوگئی۔۔۔مگر خدا کا کرم یہ ہوا کہ نواب رام پور نے ۱۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ جاری کیا جو مرزا غالبؔ کی وفات تک ملتا رہا۔اور اس دوران مرزا غالبؔ کبھی رام پور جاتے تو نواب کی طرف سے مزید ۱۰۰ روپے ان کی نذر کیے جاتے تھے۔یعنی رام پور میں مرزا غالبؔ رہیں تو ۲۰۰ روپے ماہانہ پائیں اور دہلی میں رہیں تو ۱۰۰ روپے۔مرزا غالبؔ کو ۱۰۰ روپے کا نقصان گوارا تھا مگر دہلی کے بناوہ رہ نہیں سکتے تھے۔مرزا غالبؔ کی انگریزی سرکاری پینشن کے لیے تگ ودو اور انگریزی سرکار کی بارگاہ میں ان کی بے گناہی کے بعد پینشن بحال کردی گئی۔آخری عمر میں مرزا غالبؔ بیمار رہنے لگے تھے۔اپنے ایک خط میں انھوں نے اپنی طبعی حالت کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے۔۔۔

> ''میں نہایت ضعیف ہوگیا ہوں۔حواس باختہ اور خاطر پریشان رہتی ہے۔بدن میں ضعف ضعیفی غالب ہے،سماعت سے عاری ہوں، ہاتھ پاؤں کام کم کرتے ہیں، آدمی کی صورت نہیں پہچانتا،آواز کم سنائی دیتی ہے، جو کوئی بروقت ملاقات بات کیا چاہتا ہے لکھ کر دیتا ہے اور اس کا جواب تحریری لیتا ہے۔کاغذ ،قلم ،دوات، چاقو، قلمدان نسبتاً ہر وقت پیش نظر رہتے ہیں۔خورد ونوش کے ہضم کی قوت نہیں۔زندگی کا لطف نہ رہا،موت نزدیک معلوم ہوتی ہے۔''

مرزا غالبؔ دہلی میں رہے مگر انھوں نے ذاتی مکان کبھی نہیں بنایا یا خریدا۔ ہمیشہ کرایے کے مکان میں رہے۔ دہلی کے مشہور علاقے بلی ماران میں مختلف مکانات بدلتے رہے ۔مرزا غالبؔ نے مکانات بدلے نہیں علاقہ نہیں

بدلا۔خواجہ الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے اپنی اپنی کتابوں (یادگار غالب اور آب حیات) میں مرزا غالبؔ کے کئی لطیفے بیان کیے ہیں۔کچھ لطیفے آپ کے مطالعے کے لیے درج کیے جاتے ہیں۔

''رمضان کا مہینہ تھا۔آپ نواب حسین مرزا کے ہاں بیٹھے تھے، پان منگا کر کھایا۔ایک صاحب فرشتہ سیرت، نہایت متقی و پرہیز گار اس وقت حاضر تھے، انھوں نے متعجب ہو کر پوچھا'' قبلہ! آپ روزہ نہیں رکھتے؟'' مسکرا کر بولے'' شیطان غالب ہے۔''

''مرزا غالبؔ کی قاطع برہان کے بہت سے شخصوں نے جواب لکھے ہیں اور بہت زبان درازیاں کی ہیں۔کسی نے کہا'' حضرت! آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا۔'' فرمایا'' بھائی اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دو گے؟''

''مکان کے تنگ و تاریک کوٹھری میں مرزا غالبؔ اکثر بیٹھے رہتے تھے۔ایک دن مولنا آزردہ دوپہر کے وقت مرزا غالبؔ سے ملنے آگئے۔اس وقت مرزا غالبؔ اسی تنگ کوٹھری میں بیٹھے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ چوسر کھیل رہے تھے۔یہ رمضان کا مہینہ تھا۔مولانا آزردہ کوٹھری میں وارد ہوئے تو مرزا کو چوسر کھیلتے اور شراب کی بوتل کو قریب رکھے ہوئے دیکھا۔کہنے لگے'' ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان میں شیطان قید کر لیے جاتے ہیں۔مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔'' مرزا غالبؔ نے کہا'' قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے۔''

برصغیر میں فارسی اور اردو کے منفرد اور یکتائے زمانہ شاعر مرزا اسداللہ خاں غالبؔ بلی ماران دہلی کے اپنے گھر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اس جہان فانی سے جہان باقی میں کوچ کر گئے۔مرزا غالبؔ کے اردو خطوط کے مجموعے'' اردوئے معلیٰ'' اور'' عود ہندی'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔انکا اردو دیوان'' دیوان غالبؔ'' کے نام سے چھپ کر

مقبولیت عام حاصل کر چکا ہے۔ان کا فارسی کلام بھی شائع ہوا ہے۔

7.3.2 مرزا غالبؔ کی غزل گوئی

مرزا غالبؔ اردو شاعری خاص کر غزل کے عظیم فن کار ہیں۔ان کی غزلوں میں فلسفہ،شوخی،شرارت،نزاکت، سادہ کاری،غنائیت، الہام،تصوف جیسی متنوع خوبیاں موجود ہیں۔ان کی غزلوں میں آسان الفاظ میں پوشیدہ مشکل معنوی جہان کی تلاش قاری کے لیے مسلسل ذہنی کاوش کی باعث ہوتی ہے۔مرزا غالبؔ نے فارسی زبان میں بھی اعلیٰ معیار کی شاعری کی ہے۔مرزا غالبؔ کی اردو شاعری میں ان کے سوانحی کوائف کی نشان دہی بھی کی جاسکتی ہے۔ان کا ایک نہایت مشہور شعر ہے۔۔۔۔۔

ے رنج سے خوگر ہوا انساں،تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی، کہ آساں ہوگئیں

یہ شعر نہ صرف مرزا غالبؔ کی اپنی مشکلات کی انتہاؤں کی جانب اشارہ کرتا ہے بلکہ انسانی نفسیات کی اس مثبت روش کو بھی نمایاں کرتا ہے جس میں مسائل کی کثرت حل بن جاتی ہے۔مشکلوں کا آسان ہونا یا انھیں آسان سمجھنا مثبت ذہنی رویے کی نشانی ہے۔اسی معنوی زمین کا ایک اور مزیدار شعر مرزا غالبؔ نے کہا ہے۔۔۔۔۔

ے قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہی
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

یعنی زندگی ہے جب تک غم ہیں،مشکلیں ہیں۔کم ہوں یا زیادہ مگر مشکلیں یا غم آنے ہیں۔موت سے پہلے آدمی غم سے نجات نہیں پا سکتا۔یہی بات اگر ہر خاص و عام کی سمجھ میں آجائے تو خودکشی یا اس طرح کے بے وقوفانہ عمل سے کافی جانیں بچ سکتی ہیں۔لوگ مشکلیوں سے گھبرا کر ہی اپنی جان کھودیتے ہیں،مصائب کو اپنے اوپر حاوی ہونے دیتے ہیں،غم کو خوش اور مسرت کے لمحات سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں،لہٰذا وہ مایوسی میں جینے کے عادی ہوجاتے ہیں اور بالآخر ایک دن اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کر دیتے ہیں۔مرزا غالبؔ کے درج بالا دونوں اشعار زندگی کی تلخ مگر اٹل حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔

ے دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں!
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں!

بے جان چیزوں پر کسی واقعہ یا حادثے کا اثر ہوتا کبھی نہیں دیکھا گیا۔سنگ یعنی پتھر،خشت یعنی اینٹ۔یہ دونوں ٹوٹ

جائیں یا توڑے جائیں انھیں درد نہیں ہوسکتا، ان کے احساسات نہیں ہیں، ان کے پاس دل نہیں ہے، آنکھیں نہیں ہیں۔ان کے ٹوٹ جانے یا توڑے جانے پر کسی قسم کا ردعمل نہ ہونے سے تعجب نہیں ہوتا۔مگر انسان کا دل ٹوٹ جائے یا توڑا جائے تو وہ متاثر ہوتا ہے، درد ہوتا ہے، ٹھیس لگتی ہے، آنکھیں روتی ہیں، احساسات مجروح ہوجاتے ہیں۔ یہ علامات جاندار ہونے اور حساس ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔''کیوں'' لفظ اس شعر کی مکمل کیفیت کا غماز ہے۔اس ''کیوں'' میں دل کے درد سے بھر آنے کی کیفیت کا سوال ہے،اس ''کیوں'' میں ستائے جانے پر رونے کا سوال ہے ،اور یہ ''کیوں'' صرف سوال نہیں کرتا بلکہ اپنی ناراضگی بھی جتا رہا ہے۔دل درد سے بھر آنے پر سوال کیوں؟ باز پرس کیوں؟ رونے پر سوال کیوں؟ اس کیوں کا تعلق غصہ سے ہے، آزادی کے ساتھ اپنے احساسات وجذبات کے اظہار پر تنقید کرنے کے رویے سے ہے۔

ے حسن اوراس پہ حسن ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے ،غیر کو آزمائے کیوں!

خوداعتمادی اور تفخر میں ایک باریک لکیر موجود ہوتی ہے۔''حسن اوراس پہ حسن ظن'' یہ خوداعتمادی بھی ہوسکتی ہے، خود شناسی بھی ہوسکتی ہے اور فخر بھی ہوسکتا ہے۔ تاہم ایسی اعترافِ خوبی کی صلاحیت سے بھی کم ہی لوگ متصف ہوتے ہیں۔مرزا غالبؔ کا یہ شعران کے برتاؤ اور فکر کی سمت متعین کرنے والا شعر ہے۔معشوق جانتا ہے کہ وہ خوبصورت ہے، حسین ہے، اسے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں، کسی گواہ کی ضرورت نہیں، کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔اپنے حسن پہ معشوق کو ناز ہے، بوالہوس کو کسی موقع کا ملنا محال ہے۔معشوق اپنے حسن کی وقعت اور اہمیت کو جانتا ہے اسے بوالہوس کی نظروں سے آزمانے کی ضرورت محسوس نہیں ہے۔

مرزا غالبؔ کی شاعری میں تصوف، طنز ومزاح، رمز وایمائیت، معنوی تہہ داریاں، زندہ دلی اور خوش طبعی اور سہل ممتنع جیسی خوبیاں انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز بنا دیتی ہیں۔شوخی اور ظرافت مرزا غالبؔ کے مزاج کا حصہ تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مرزا غالبؔ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
۲۔ مرزا غالبؔ کس مغل بادشاہ کے استاد مقرر ہوئے تھے؟
۳۔ مرزا غالبؔ کی شادی کس عمر میں ہوئی اور ان کی دلہن کا نام کیا تھا؟
۴۔ مرزا غالبؔ کا مکمل نام کیا ہے؟

۵۔ نواب رام پور کی جانب سے مرزا غالبؔ کو ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، بتائیے اس کی رقم کیا تھی؟

۶۔ مرزا غالبؔ کے خطوط کے مجموعوں کے نام لکھیے۔

۷۔ مرزا غالبؔ کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

7.4 نواب مرزا داغؔ دہلوی

7.4.1 داغ دہلوی کی حیات اور شخصیت

نواب مرزا داغؔ دہلوی ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ساری زندگی (دکن کے ابتدائی تین سال منہا کر کے) عیش ونشاط میں بسر ہوئی۔ نواب شمس الدین کے گھر انھوں نے آنکھیں کھولیں، ایام طفولیت کے چند برس وہ نواب رام پور کے آشیانے میں گزار چکے تھے، اس کے بعد ان کی قسمت میں قلعہ معلیٰ کی زندگی آئی۔ نواب شمس الدین کو انگریز افسر کے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی تو مرزا داغؔ اور ان کی والدہ پر قیامت ٹوٹ پڑی، تاہم مختصر عرصے کے بعد ان کی والدہ وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم ولی عہد مرزا فخرو سے متعلق ہوگئیں اور قلعہ معلیٰ چلی آئیں، اس طرح داغؔ کی زندگی میں عشرت کی فراوانی رہی۔ قلعہ معلیٰ میں انھیں ذوقؔ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ داغؔ کا قلعہ کا یہ دور ۱۸۴۴ء سے شروع ہو کر مرزا فخرو کی وفات ۱۸۵۶ء تک یعنی تقریباً ۱۲ یا ۱۳ سال کا رہا۔ یعنی اپنی عمر کے ۱۳ویں سال داغؔ قلعہ کے رہائشی ہوگئے اور شباب کے ابھرنے کے اس دور سے شباب کی پختگی کے دور ۲۵ یا ۲۶ سال کی عمر تک قلعہ کی ساری رنگینیاں داغؔ کے سامنے بانہیں کھولے سراپا منتظر تھیں۔ داغؔ نے اس پر تعیش پرورش اور تربیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے قلعہ کی نزاکت سے لبریز زبان پر عبور حاصل کیا، کاروبار عشق کے لطیف جذبات کا عملی مظاہرہ دیکھا اور اسے اپنے جذب وعمل میں رچا بسا لیا، آسودگی کے سارے مزے تجربے کی دہلیز پار کرتے ہوئے حاصل کیے، نازک اندام احساسات سے واقفیت حاصل کرلی، درباری شائستگی کو سیکھا، زبان کی صحت اور باریکیوں سے آشنائی حاصل کی، محاوروں کے استعمال کا سلیقہ سیکھا۔ غرض قلعہ کی زندگی داغؔ کے لیے ایک بہترین تربیت گاہ تھی، جہاں انھوں نے نہ صرف اپنی شاعرانہ صلاحیت کو نکھارا، بلکہ اردو شاعری کی لطافت میں اضافہ ہی کیا، عشق، محبت، وصل، ہجر کے نازک جذبات کی عکاسی سیکھی، روٹھنے منانے کے تمام نخرے تجربہ کیے، قلعہ معلیٰ میں رہتے ہوئے یہاں کی علمی محفل سے مستفید تو ہوتے ہی تھے دہلی کے نابغہ روزگار شاعروں سے بھی ملاقاتوں کا موقع ملتا رہا ہے۔ ان میں مرزا غالبؔ، امام بخش صہبائیؔ، مومن خان مومنؔ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ وغیرہ اہم ہیں۔ استاد ذوق کی شاگردی کا ایک فائدہ یہ تھا کہ دہلی کے مشاعروں

میں مرزا داغ مدعو کیے جاتے۔قلعہ معلیٰ میں رہتے ہوئے ہی وزیر خانم نے مرزا داغ کی شادی کر دی تھی۔

مرزا فخرو کی وفات کے بعد وزیر خانم مرزا داغ کو لے کر اپنی بہن عمدہ بیگم جو نواب رام پور یوسف علی خان سے منسوب تھی، کے پاس رام پور چلی آئیں۔مرزا داغ رام پور میں نواب صاحب کے دربار سے وابستہ ہو گئے، بلکہ بہت جلد نواب کے منظور نظر بن گئے تھے۔ یہاں انھوں نے نواب صاحب یوسف علی خان اور ان کے بعد نواب کلب علی خان کے دور تک قیام کیا۔یعنی ۱۸۸۷ء تک۔اس دوران مرزا داغ نہ صرف شعر و ادب میں اپنے کمالات دکھا رہے تھے بلکہ مقامی شعرا سے ادبی چشمک کے کارزار سے بھی گزر رہے تھے۔نواب صاحب مرزا داغ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔وہ کلکتہ گئے تو داغ کو اپنے ساتھ لے گئے، حج کے لیے گئے تب بھی مرزا داغ کو اس نعمت سے سرفراز کر گئے۔

داغ کو کون دینے والا ہے جو دیا اے خدا دیا تو نے

نواب کلب علی خان کے انتقال کے بعد مرزا داغ رام پور سے حیدرآباد چلے آئے۔اور باقی ماندہ زندگی انھوں نے یہی بسر کی۔ یہ بات درست تھی کہ حیدرآباد آنے تک داغ عمر کی تقریباً ۵۷ بہاریں دیکھ چکے تھے، اور بحیثیت ایک استاد شاعر کے ان کی شناخت بن چکی تھی، اردو زبان و ادب میں ان کی اہمیت قائم ہو چکی تھی، انھیں فصیح الملک کہا جانے لگا تھا، مگر حیدرآباد تشریف لانے کے بعد انھیں جس استقبال اور حکومتی التفات کی امید تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔تاہم وہ ڈٹے رہے۔ مقامی شعرا ان کے دولت کدے پر حاضر ہوتے، شاعری کی محفلیں برپا ہوتیں۔مگر مرزا داغ کی نظر جس توجہ کی منتظر تھی، وہ ابھی اس طرف سے بے پروا تھی۔۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۱ء تک مسلسل تین سال مرزا داغ نے حکومتی توجہ کا انتظار کیا یعنی نواب حیدرآباد کی نگاہ کرم کا۔جب مسلسل نظر انداز ہوتے رہے تو دلبرداشتہ ہو کر داغ نے حیدرآباد سے ہجرت کرنے کا ارادہ کیا۔ اتفاق اسی وقت، سالم تین سال بعد، نواب صاحب کی جانب سے ایک غزل اصلاح کے لیے داغ کے پاس آئی۔اور پھر مرزا داغ ایک ہزار روپیہ ماہانہ کے سرکاری ملازم بن گئے۔اور بقیہ زندگی عیش و عشرت میں گزاری۔

۱۶ر فروری ۱۹۰۵ کو حیدرآباد میں مرزا داغ دہلوی کا انتقال ہو گیا۔اور عیش و نشاط کا ایک دور ختم ہو گیا۔مرزا داغ کے کل چار دیوان شائع ہوئے ہیں۔گلزارِ داغ (۱۸۷۸ء)، آفتابِ داغ (۱۸۸۴ء)، مہتابِ داغ (۱۸۹۳ء) اور یادگارِ داغ (۱۹۰۵ء)۔

7.4.2 مرزا داغؔ کی غزل گوئی

مرزا داغؔ دہلوی اردو کی لطیف شعری روایت کے امین ہیں۔ ان کی شاعری ناز و ادا اور نزاکت کے عناصر سے مملو شاعری ہے۔ چونکہ درباری ماحول سے آشنا تھے، وہاں کی زبان اور ناز انداز کو انھوں نے اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔ ان کی غزلوں میں ہجر وصال، عشق محبت، شکوہ و شکایت جیسے تمام موضوعات موجود ہیں۔ بعد ازاں دہلوی شاعرانہ فضا کی آغوش میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے تصوف کی دھمک بھی ان کے کلام میں مل جاتی ہے۔

ؔ ناروا کہیے، ناسزا کہیے
کہیے کہیے مجھے برا کہیے

عاشق اور معشوق کی لطیف چشمک اس شعر میں نمایاں ہے۔ مرزا داغؔ کی شاعری میں جذبات کی نرم ادائیگی ایک وصف خاص ہے۔ حالانکہ یہ شعر ناراضگی کو ظاہر کرنے والا ہے مگر الفاظ کے انتخاب نے اس میں ایک دلچسپ شوخی نمودار کر دی ہے۔ ناروا، ناسزا یا برا تینوں ناپسندیدہ صفتیں ہیں۔ ان صفتوں کو اپنی جانب مبذول کرنے میں بھی عاشق کو پس و پیش نہیں ہے، کیوں؟ سبب یہ ہے کہ یہ منفی صفتیں معشوق کی طرف سے شکایت کے روپ میں مل رہی ہیں۔ اور عاشق اسی پر خوش ہے کہ کچھ نہ کچھ تو محبوب کی طرف سے مل رہا ہے۔ عاشق اسے سخت مزاجی کے ساتھ بھی قبول کر سکتا تھا، ناراضگی کا جواب ناراضگی کے ساتھ بھی دے سکتا تھا۔ مگر نہیں ۔۔۔! وہ جانتا ہے کہ اگر معشوق کوئی شکوہ کر رہا ہے تو وہ درست ہوگا، کوئی شکایت درج کر رہا ہے تو وہ حق بہ جانب ہوگی، مجھ سے کسی غلطی کا ارتکاب ہو سکتا ہے مگر معشوق سے نہیں۔ اور میری غلطی کی سزا تو مجھے ملنی ہی چاہیے۔ اسی لیے اگر میں ناروا کہلاؤں، ناسزا کہلاؤں یا برا کہلاؤں تو یہ مجھے قبول کرنا ہوگا۔

ؔ آ گئی آپ کو مسیحائی
مرنے والوں کو مرحبا کہیے

مسیحائی اور مرنے والے یہ دونوں متضاد خصوصیات کے حامل ہیں۔ یہاں لطیف طنز کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ معشوق کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر بیماری کا علاج جانتا ہے۔ یعنی وہ مسیحا ہے۔ بھلا عشق کی تڑپ، محبت کی بے چینی کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟ لیکن معشوق کے دعوی پر قائم رہنے کے بعد یہی ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ معشوق اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ خود اس کے عاشق اس کے لیے مرے جا رہے ہیں اور وہ مسیحائی کا دعوی کیے جا رہا ہے۔ کیا یہاں تجاہل عارفانہ کا استعمال کیا گیا ہے؟ شاید ہاں۔ بلکہ یہاں طنز کا پیرایہ استعمال میں لایا گیا ہے۔ کہ دیکھو مسیحائی کا دعوی ہے اور لوگ انہی کی وجہ سے مرے جا رہے ہیں۔ گویا مسیحائی نہ ہوئی قتل عام ہوا۔ اسی لیے مرنے والوں کو مرحبا کہنے کی صلاح دی جا رہی ہے۔

ب آپ کا خیر خواہ میرے سوا
ہے کوئی اور دوسرا، کہیے

اپنی وفاداری ثابت کرنے کے بعد بھی ، اپنی محبت کا اعلان کرنے کے بعد بھی، اپنے عشق کا اظہار کرنے کے بعد بھی معشوق پر کوئی اثر نہ ہوتا دیکھ کر عاشق مجبور ہوگیا کہ مدعا بیان کرنے کے لیے احسان یاد دلانے کا طرز اختیار کرنا ضروری ہوگیا ہے۔خیر خواہی کسی ایک کام سے ظاہر نہیں ہوتی۔خیر خواہی کا دم بھرنے کے لیے کسی کے لیے مسلسل کام کرنا پڑتا ہے، اس کے مفادات کا خیال رکھنا پڑتا ہے، اس کے نقصانات سے اسے بچانا پڑتا ہے، اسے خوش رکھنا پڑتا ہے، اس کی خواہشات کا احترام کرنا پڑتا ہے، اس کی تمناؤں کو پورا کرنے کے جتن کرنے پڑتے ہیں، اس کی تکالیف دور کرنی ہوتی ہیں، اس کی ضروریات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔اور جب عاشق یہ سارے کام سرانجام دیتا ہے تو وہ خیر خواہی کا دم بھر سکتا ہے۔اور اس شعر میں اس نے اگر خیر خواہ ہونے کا دعوی پیش کیا ہے تو ضرور بالضرور اس نے مذکورہ تمام ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا ہوگا اور معشوق کا بھروسہ جیتا ہوگا۔اسی لیے کہہ رہا ہے کہ آپ کے اطراف مجھ سے زیادہ قابل یقین، قابل بھروسہ اور خیر خواہ کوئی نہیں مل سکتا ہے۔اگر کوئی ہے تو بتا دیجیے۔کہیے لفظ نے معشوق کو اس بات کی آزادی دی تھی کہ وہ اس خیر خواہی کے دعوی کے جواب میں کچھ کہہ دیتا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مرزا داغ دہلوی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
۲۔ مرزا داغ دہلوی کی والدہ کا نام کیا تھا؟
۳۔ مرزا داغ دہلوی قلعہ معلیٰ میں کتنا عرصہ قیام پذیر تھے؟
۴۔ دہلی میں بغاوت کے بعد مرزا داغ دہلوی کس ریاست میں ہجرت کر گئے تھے؟
۵۔ مرزا داغ دہلوی نے حج کی سعادت کس کے ساتھ حاصل کی؟
۶۔ ریاست حیدرآباد میں مرزا داغ دہلوی کی آمد کس سال ہوئی؟
۷۔ مرزا داغ دہلوی کے کتنے اردو دیوان شائع ہو چکے ہیں؟ اور ان کے نام کیا ہیں؟
۸۔ مرزا داغ دہلوی کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

7.5 شادؔ عظیم آبادی

7.5.1 شادؔ عظیم آبادی کی حیات اور شخصیت

اردو شاعری مختلف ادوار میں تقسیم کی جاتی ہے۔ شادؔ عظیم آبادی اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب قدیم شاعری سرسید کی ترقی پسند فکر سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے عمل سے گزر رہی تھی۔ شادؔ کا اصل نام سید علی محمد تھا۔ وہ قدیم عظیم آباد اور حال پٹنہ کے ایک معروف اور ثروت مند گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۸ جنوری ۱۸۴۶ء ہے۔ ان کے والد کا نام سید عباس مرزا تھا۔ شادؔ نجیب الطرفین تھے۔ ان کے بچپن کے دن ننیہال میں گزرے۔ ان کا ننیہال بھی متمول خاندان تھا۔ انھوں نے امیرانہ ماحول میں پرورش پائی مگر انھیں ضعف معدہ اور شدت اختلاج قلب کی شکایت تاعمر رہی۔ تاہم انھوں نے اپنی بیماری اور کمزوری کو خود پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ انھوں نے تعلیم مکمل کی، ملازمت کی اور شعر و سخن کو بھی آباد کیا۔ طبیعت میں بے باکانہ پن تھا۔ مطالعہ خوب کرتے تھے۔ انھیں اپنے علاقے کی تاریخ سے لگاؤ تھا۔ انھوں نے ''بہار کی تاریخ'' دو جلدوں میں رقم کی ہے۔ کتاب ''نوائے وطن'' میں بہار کے شرفا کی لسانی خامیوں پر قلم چلایا ہے۔ اس کتاب نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ لوگ ان کے گھر کے باہر آ کر احتجاج کرتے تھے، انھیں برا بھلا کہتے تھے۔ لیکن شادؔ اپنے خیالات پر قائم رہے۔ انھوں نے مخالفت کی پرواہ نہیں کی۔ نثر کے میدان میں شاد نے اور بھی کئی معرکے سر کیے ہیں۔ انھوں نے ''پیر علی'' ناول پہلی جنگ آزادی کے پس منظر میں رقم کیا۔ خودنوشت لکھی اور اسے محفوظ کیا۔ کئی بار ان کے شاگردوں اور قدردانوں نے ان سے اسے شائع کرنے کا مشورہ دیا مگر انھیں ہر بار کسی نہ کسی تشنگی کا احساس ہوتا اور وہ اپنا ارادہ ملتوی کر دیتے۔ بالآخر ان کے شاگرد مسلم عظیم آبادی نے مسودہ ان سے حاصل کیا اور اسے ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' کے نام سے طبع کروایا۔ شعر کہنے کا شوق تھا۔ ان کے ساتھیوں کے درمیان فارغ اوقات میں بیت بازی کا مقابلہ ہوتا تھا جو اس دور کا چلن تھا۔ یہی سے انھیں غزلیں کہنے کی تحریک ملی۔ اپنے وقت کے معروف رسالہ ''مخزن'' کے مدیر سر عبدالقادر سروری جب عظیم آباد آئے تو انھوں نے شادؔ سے مخزن کے لیے کلام بھیجنے کی درخواست کی۔ شادؔ نے انھیں اپنا کلام بھیجا اور وہ مسلسل ''مخزن'' میں شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے غزلیں، مرثیے، رباعیاں، قطعات، مخمس اور مسدس لکھے۔ لیکن ان کی پہچان ان کی پر اثر غزلیں تھیں۔

شادؔ عظیم آبادی کی شادی سترہویں سال میں کلثوم فاطمہ سے ہوئی۔ ان سے شادؔ کو آٹھ بچے ہوئے مگر سوائے آخری بیٹے کے کوئی زندہ نہ رہا۔ بچے ایام طفولیت میں ہی انتقال کر جاتے۔ آٹھویں بچے کے وقت ان کی بیوی بیمار تھی، بیٹا پیدا ہوا اور دوسرے دن وہ انتقال کر گئیں۔ بیٹے کا نام سید حسین خان تھا۔ تقریباً چار سال بعد شادؔ نے کلکتہ کی ایک خاتون زہرہ بیگم سے نکاح ثانی کیا۔ ان سے ایک بیٹی آمنہ بیگم پیدا ہوئی۔

شادؔ عظیم آبادی کی اردو اور فارسی زبانوں کی تعلیم کے لیے بالترتیب میر سید محمد اور حاجی محمد رضا صاحبان نے مشقت اٹھائی۔عربی دانی کے لیے مولوی سید فرحت حسین سے درس لیا کرتے تھے۔سن ستاون کے ہنگامے سے قبل مولوی سید عبداللہ شاہ صاحب سے بھی عربی پڑھی۔شادؔ کی وضع قطع اس طرح تھی چارفٹ پانچ انچ لمبے، سانولی رنگت، داڑھی خط کشیدہ، چہرے کے خدوخال درست، جسمانی ساخت میں دبلے پتلے، ایرانی ٹوپی، شیروانی کبھی کبھی ترکی کوٹ اور انگریزی بوٹ۔ایک زمانے میں زیب وزینت کا خاص خیال رہتا تھا، کپڑے، بال حتی کہ مکان کی آرائش میں بھی عمدگی کو سرفہرست رکھتے تھے۔مگر حالات نے آخری عمر میں ان سے یہ سارے ناز وانداز چھین لیے۔سیر وسیاحت کا شوق تھا، ہندوستان کے کئی شہروں کے سفر کیے۔دولت مند تھے، ملازمت بھی معقول تھی وہ میونسپل کمشنر کے عہدے پر طویل عرصے تک فائز رہے۔حکومت کی جانب سے سالانہ وظیفہ بھی جاری تھا۔تاہم ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔معدے اور قلب کی مسلسل بیماریوں نے انھیں مضمحل کردیا تھا۔وہ اکثر بیمار رہتے تھے۔ساتھ ہی ان کا تصنیفی سلسلہ جاری تھا جس سے نہ صرف ان کے بہی خواہوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا بلکہ حاسدوں کی ایک فوج بھی پیدا ہوتی رہی جس نے ان کے خلاف تسلسل کے ساتھ معرکہ آرائی جاری رکھی۔انھیں اپنے مصاحبوں سے بھی بعد ازاں اذیتیں برداشت کرنی پڑیں ہیں۔ابن الوقتوں نے بھی ان کو لوٹا کھسوٹا، دھوکہ دیا بلکہ انھیں برباد کردیا۔زندگی کی تقریباً ۸۰ بہاروں کا لطف اٹھانے کے بعد شادؔ عظیم آبادی ۷ جنوری ۱۹۲۷ء کو پٹنہ میں انتقال کر گئے۔

شادؔ کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔سات آٹھ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ان کے والد انھیں مذہبی عالم بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے انھیں عراق بھیجنے کی تیاری کررہے تھے، مگر شادؔ کی دلچسپی کا محور کچھ اور تھا۔وہ شعر کہتے رہے، لوگوں کو سناتے رہے اور پسند کیے جاتے رہے۔ایک بار عظیم آباد کے معروف شاعر اور استاد سید شاہ الفت حسین فریادؔ کو اپنی غزل اصلاح کے لئے دی انھوں نے کلام پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور اس طرح شادؔ نے باضابطہ ایک استاد کی شاگردی حاصل کر لی۔اس وقت عظیم آباد ایک علمی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، وہاں اکثر مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔شادؔ ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور غزلیں پڑھتے۔اس طرح شادؔ کی شناخت ایک مستند غزل گو شاعر کے بن گئی۔

شادؔ کی شاعری میں وقت کے ساتھ ساتھ پختگی آتی گئی ہے۔ان کے تجربے نے، ان کے فلسفیانہ مزاج نے، ان کے باطنی کرب نے، ان کی جسمانی نادرستگی نے ان میں اضطراب نہیں پیدا کیا بلکہ ایک ٹھہراؤ اور مضبوط شعور کو بیدار کیا جس کا احساس ان کی غزلوں کے ہر شعر سے ہوتا ہے۔جس طرح کی جسمانی پریشانیوں میں شادؔ مبتلا رہے ہیں، جس طرح کے دھوکے شادؔ نے کھائے ہیں، جس طرح کی مخالفتیں شادؔ نے برداشت کیں ہیں، اس کے بعد انھیں قنوطیت کے سمندر میں غوطے لگانے چاہیے تھے۔۔۔! مگر نہیں انھوں نے اپنے لئے ایک جدا راہ متعین کی۔ان کا کلام تجربوں کی

ایک لامحدود دنیا کو قارئین کے سپرد کرتا ہے۔ ان کے کلام میں اثر آفرینی ہے، وہ آسان الفاظ کے انتخاب کے ساتھ فلسفیانہ موضوعات کو سہل بنا کر پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

کجا میں اور کجا اے شادؔ دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں
تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا، میں باز آیا

7.5.2 شادؔ عظیم آبادی کی غزل گوئی

شادؔ عظیم آبادی ایک رجحان ساز شاعر تھے۔ انھوں نے اردو غزل کی روایت میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ان کی غزلیں انفرادی غم والم کو آفاقی مقام عطا کرتی ہیں۔ انھوں نے غزلوں میں جذبات واحساسات کی ترجمانی کی اور نئے رنگ وآہنگ اور تازگی وطراوت کے ساتھ غزل میں انوکھے تجربے کیے۔ غزل کی سب سے اہم خوبی رمز واشارہ شادؔ کے کلام کی نمایاں صفت ہے۔ انھوں نے اشاروں کنایوں میں نہ صرف اپنے دور کے حالات بیان کیے ہیں بلکہ ذاتی تجربات، نقصانات، احساسات کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری عام قاری کے دل کو چھو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کے اشعار میں دلکشی ہے، ترنم ہے، شیرینی ہے اور یہ صفات انھیں قاری کے قریب کر لیتی ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی دبستان عظیم آباد کے سب سے اہم نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری اردو کے اس بھولے بسرے علاقے کی پہچان ہے اور اس کے ذریعے شاعری تاریخ میں اس کے درج ہونے کی علامت بھی۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

شادؔ کا یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ انسان مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آیا اس کی کوئی وقعت ہے یا نہیں؟ مصائب یا مسائل کا طوفان اسے ہر طرف سے پریشان کیے رہتا ہے اور دل مزید تمنائیں پیدا کرتا رہتا ہے۔ گویا دل کی صورت ایک ایسا کھلونا ہاتھوں میں تھما دیا گیا ہے جس سے بہل رہے ہیں، تمناؤں میں الجھے ہوئے ہیں۔ تمنائیں بھی وہ جن کے مکمل ہونے کے امکانات دور دور تک نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی تمنائیں ہیں کہ جاگ رہی ہیں،

بیدار ہورہی ہیں، پیدا ہورہی ہیں۔ یہ شعر مایوس ہونے سے محفوظ رکھتا ہے، کافی ساری منطق سمجھنے کے بعد بھی حالات کو کھیل اور امیدوں کو کھلونا سمجھنا ایک مثبت اور مضبوط شعور کی شہادت ہے۔

ؔ ہوں اس کوچے کے ہر ذرے سے آگاہ
ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

اس رمز یہ شعر میں شادؔ نے معنوی جہان آباد کیے ہوئے ہیں۔ کوچہ یا گلی اور اس کے ہر ذرے سے آگاہی کا دعویٰ کیا معنی رکھتا ہے؟ کہ جہاں شاعر مدتوں آیا گیا ہے! شاعر اس گلی یا کوچے میں مدتوں کس کی تلاش میں آیا گیا ہے؟ اور کیا اسے اپنی متلاشی شئے مل گئی ہے؟ یہ کوچہ اس کا جانا پہچانا ہے۔ کیا اب شاعر اس کوچے کی جانب سفر نہیں کرتا؟ نظر نہیں کرتا؟ مدتوں ادھر سے آنا اور جانا کیا زمانہ حال میں موقف ہے؟ ایسے بہت سارے سوالات ہیں۔ مگر جو بات نہایت واضح ہو کر سامنے آرہی ہے وہ یہ ہے کہ شاعر معشوق کی گلی سے آشنا ہے۔ یعنی شاعر کا معاشقہ رہا ہے۔ دیوانگی کی حد تک چاہت رہی ہے، دل کسی کے نام سے دھڑکتا رہا ہے، ذہن کسی کی یاد سے معمور رہا ہے۔ اسی لیے شاید اچانک وہ گلی وہ کوچہ سامنے آجانے پر بے ساختگی میں □ زبان سے یہ شعر نکل گیا ہے۔ ہر ذرے سے آگاہی کا دعویٰ اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ نہایت دلبستگی کے ساتھ اور دلجمعی کے ساتھ اس کوچے کا مشاہدہ نہ کیا گیا ہو، کئی کئی گھنٹے اس گلی میں ضائع نہ کیے گئے ہوں، انتظار کے طویل لمحات سے نبرد آزمائی نہ ہوئی ہو۔ اسی لیے تشریح میں ''دیوانگی کی حد تک چاہت'' کی بات کی گئی ہے۔ کہ جب تک دیوانگی نہ ہو اس طرح کی حرکتیں سرزد نہیں ہو سکتیں۔

ؔ دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم!
میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

شادؔ کا یہ شعر تجاہل عارفانہ کی عمدہ مثال ہے۔ بزم میں عاشق کی موجودگی رونق بزم یعنی معشوق کے لیے حیرانی کا باعث بنی ہوئی ہے کہ اس بزم میں آنے کی دعوت تو عاشق کو نہیں دی گئی تھی، وہ کیسے آیا؟ اس نے کیسے جرات کی؟ کیسی ہمت کر گیا؟ لہٰذا اس سے باز پرس کرنا ضروری ٹھہرا۔ عاشق بھی اپنے مزاج کا ایک ہی تھا۔ اس نے فی البدیہہ ''دلِ مضطر'' کو مورد الزام ٹھہرایا۔ مضطرب دل نے، بے چین دل نے، تڑپتے ہوئے دل نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس بزم میں بلا اجازت چلا جائے۔ دل سے مجبور ہو کر لامحالہ معشوق کی خفگی کے باوجود اسے یہاں آنا پڑا۔ عاشق جانتا ہے کہ بزم کی رونق معشوق ہے، محفل کی مرکزی شخصیت معشوق ہے، اور اس بزم میں دیدارِ یار کے لیے اس کا جانا لازمی تھا۔ مگر کیا کیا جائے کہ دعوت نہیں ملی۔ تاہم وہ دل سے شکست کھا کر وہاں پہنچ جاتا ہے۔ معشوق شرمندگی اور ناراضگی کے ساتھ اس سے آمد کا سبب

پوچھتا ہے۔اور وضاحت کے طور پر عاشق ''دلِ مضطر'' کی جانب اشارہ کر دیتا ہے۔

ے کجا میں اور کجا اے شادؔ دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

یہ شعر تصوفانہ مزاج کا حامل ہے۔شادؔ کی شاعری میں تصوف کی چاشنی بھی موجود ہے۔اس غزل کا پہلا شعر'' تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں'' بھی تصوف کی روایت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔تصوف میں دنیا سے دل نہ لگانا، دنیاوی معاملات میں غرق نہ ہونا بنیادی تصور ہے۔صنف غزل کا یہ وصف خاص ہے کہ اس میں مختصر الفاظ کے ساتھ کسی فلسفہ یا نکتہ کو نہایت آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔شادؔ نے دنیا کی بے ثباتی اور اس کے ہنگاموں پر اپنے تشویش ظاہر کی ہے۔شاعر جانتا ہے کہ دنیا مستقل رہنے کی جا نہیں ہے، بس گزارے بھر کی ہے۔اصل دنیا تو آخرت کی دنیا ہے اور اصل ٹھکانہ تو آخرت کا گھر ہے۔یہ دنیا ہمارے لیے اجنبی جگہ ہے، ہم یہاں مسافر ہیں۔یہ شعر حیرت واستعجاب کے ساتھ سوالیہ انداز میں ادا کیا گیا ہے۔شاعر حیرت بھی ظاہر کر رہا ہے اور جاننا بھی چاہ رہا ہے کہ کہاں میں اور کہاں یہ دنیا! شعر میں فارسی لفظ کجا یعنی'' کہاں'' کا ایک تعلق دوسرے مصرع کے'' کہاں'' سے ہے اور دوسرا تعلق ''کس'' سے ہے۔جبکہ'' جگہ'' کا راست تعلق ''دنیا'' سے ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ شادؔ عظیم آبادی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
۲۔ شادؔ عظیم آبادی کے والد کا نام کیا تھا؟
۳۔ بہار کے تعلق سے لکھی ہوئی شادؔ عظیم آبادی کی دو کتابوں کے نام لکھیے۔
۴۔ جنگ آزادی کی پس منظر میں لکھا ہوا شادؔ عظیم آبادی کا نام کون سا ہے؟
۵۔ شادؔ عظیم آبادی کی خودنوشت سوانح حیات کس نام سے شائع ہوئی ہے؟
۶۔ شاعری میں شادؔ عظیم آبادی کے استاد کون تھے؟
۷۔ شادؔ عظیم آبادی کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

7.6 خلاصہ

مرزا غالبؔ، شادؔ عظیم آبادی اور داغؔ دہلوی تین متفرق مزاج اور کلام کے شاعر ہیں۔ان کی زندگیوں کے معاملات میں بھی یکسانیت نہیں ہے۔تاہم ایک بات جوان تین ہستیوں کوایک لڑی میں پروتی ہے وہ ہے ان کا متاثر کن کلام۔بنیادی طور پر تین غزل کے شاعر ہیں۔تینوں نے دور مغلیہ میں آنکھیں کھولیں۔کسی نے اس دور کوقریب سے دیکھا ،کسی نے اس کا حصہ بنا منظور کیا اور کسی نے بچپن کے دنوں میں اس مسمار ہوتی مغلیہ حکومت کا نظارہ کیا۔مرزا غالبؔ نے اس دور کونہایت قریب سے دیکھا اسی لیے ان کے کلام میں ایسے اشارات کی موجودگی،جس سے اس دور کی عکاسی ہوسکتی ہے،تلاش کی جاسکتی ہے۔مرزا داغؔ دہلوی نے قلعہ کی زندگی میں شرکت کی ہے۔قلعہ کی نزاکتیں ان کے کلام میں جابجا مل جاتی ہیں۔شادؔ عظیم آبادی فلسفیانہ روابط کواپنے کلام میں روانی سے پیش کرتے ہیں۔یہ اکائی طلبا کوان تین منفرد شاعروں کی حیات اوران کے کلام کی خوبیوں سے آشنا کرتی ہے۔

7.7 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیے۔

۱۔ شادؔ عظیم آبادی کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیجیے۔

۲۔ داغ دہلوی کے سوانحی کوائف پر مختصراً نوٹ لکھیے۔

۳۔ فارسی کی اسامی کے سلسلے میں مرزا غالب کے ساتھ ۱۹۴۲ء میں دہلی کالج میں پیش آیا واقعہ بیان کیجیے۔

(ب) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جواب لکھیے۔

۱۔ مرزا غالبؔ کی حیات پر سیر حاصل مضمون قلم بند کیجیے۔

۲۔ مرزا غالبؔ کی شاعری پر اپنی آرا بیان کیجیے۔

۳۔ مرزا داغؔ دہلوی کی حیات اور شخصیت پر معلوماتی مضمون سپرد قرطاس کیجیے۔

۴۔ شادؔ عظیم آبادی کی حیات اور شاعری پر ناقدانہ تجزیہ پیش کیجیے۔

(ج) درج ذیل اشعار کی مع سیاق وسباق تشریح کیجیے۔

۱۔ غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں!

۲۔ ہوش جاتے رہے رقیبوں کے
داغ کو اور باوفا کہیے

۳۔ نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

7.8 فرہنگ

تفہیم	سمجھانا
متقاضی	تقاضا کرنے والا
ثروت مند	دولت مند
متعارف	آپس میں جان پہچان والے۔معروف
نمائندگی	ترجمانی۔قائم مقامی
معرکہ	جنگ۔ہنگامہ
کفالت	ذمہ داری۔ضمانت
پسماندگان	بچے ہوئے۔باقی رہے ہوئے
ایام طفولیت	بچپن کے دن
ودیعت	سپردگی۔امانت
متروک	ترک کیا ہوا
تردد	تذبذب۔اندیشہ۔تشویش
شرف تلمذ	شاگردی کا شرف
متمول	مال دار۔دولت مند
اختلاج قلب	ایک مرض جس میں دل زور زور سے دھڑکتا ہے
مضمحل	رنجیدہ۔مغموم۔اداس۔گم ہونے والا
مستند	سند پایا ہوا۔قابل اعتبار

اضطراب — بے چینی ۔ بے قراری

قنوطیت — ناامیدی ۔ مایوسی

استعجاب — حیرت ۔ تعجب

7.9 کتابیات

دیوان غالبؔ از مرزا اسداللہ غالبؔ

احوال غالبؔ مرتب مختار الدین احمد

یادگارِ غالب از الطاف حسین حالی

آب حیات از محمد حسین آزاد

غالبؔ: فکر و فن مرتب شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی

غالبؔ نامہ از شیخ محمد اکرام

فسانہ غالبؔ از مالک رام

شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی از محمد مسلم عظیم آبادی

کلیات شادؔ از شادؔ عظیم آبادی

کچھ شادؔ عظیم آبادی کے بارے میں از قاضی عبدالودود

مطالعہ شادؔ از شاہ عطا کاکوی

شادؔ عظیم آبادی (مونوگراف) از ذیشان فاطمی

شادؔ کا عہد اور فن از نقی احمد ارشاد

شادؔ عظیم آبادی: حیات اور خدمات مرتب ڈاکٹر رضا حیدر

انتخاب غزلیات داغؔ مرتب قاضی جمال حسین

داغؔ از تمکین کاظمی

مرزا داغؔ دہلوی: حیات اور کارنامے مرتب کامل قریشی

داغؔ دہلوی مرتب شاہد ماہلی

داغؔ دہلوی (مونوگراف) از مخمور سعیدی

مرزا داغؔ دہلوی کی شاعری	از	سید محمد فاروق
انتخاب کلام داغؔ	از	مسعود الحسن صدیقی

☆☆☆

اکائی۔ 8 : امجدؔ حیدرآبادی، یاس یگانہؔ چنگیزی

ساخت :

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 امجدؔ حیدرآبادی: حیات اور شخصیت

8.4 امجدؔ حیدرآبادی کی رباعی گوئی

8.5 امجدؔ حیدرآبادی کی رباعیاں اوران کی تشریحات

8.6 یاس یگانہؔ چنگیزی: حیات اور شخصیت

8.7 یاس یگانہؔ چنگیزی کی رباعی گوئی

8.8 یاس یگانہؔ چنگیزی کی رباعیاں اوران کی تشریحات

8.9 خلاصہ

8.10 نمونۂ امتحانی سوالات

8.11 فرہنگ

8.12 کتابیات

8.1 اغراض ومقاصد

یہ اکائی اردو کی ایک خاص صنف رباعی کے مطالعے تک محدود ہے۔اس میں بھی صرف دو رباعی گوشعرا کا تفصیلی مطالعہ ہوگا۔امجدؔ حیدرآبادی اور یگانہؔ چنگیزی مزاج اور حالات کے مخالف تجربات رکھنے والے شعرا ہیں۔اس اکائی میں ان شعرا کی نہ صرف حیات اور شخصیت سے واقفیت حاصل کی جائے گی بلکہ ان کے کلام کی تشریح کے ذریعہ ان کی تخلیقی حدت سے بھی آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

8.2 تمہید

اردو شاعری میں رباعی کی صنف مقبول تو رہی ہے مگر اس میں جو شہرت امجدؔ حیدرآبادی، رواںؔ، فراقؔ اور یگانہؔ کو حاصل ہوئی وہ قابل ذکر ہے۔ چار مصرعوں کی اس خوبصورت صنف میں زندگی کا نہایت اہم فلسفہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مکمل جائزہ اور تجربہ بیان کیا جاتا ہے۔ امجدؔ حیدرآبادی اور یگانہؔ چنگیزی اپنے میدان میں یکتائے روزگار تھے۔ اردو رباعی گوئی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان دونوں کے ناموں کو اس میں شامل نہ کیا جائے۔ دونوں شعرا کا مزاج اور شاعری کے تئیں رویہ جداگانہ نوعیت کا رہا ہے۔ ان کا مطالعہ طالب علموں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

8.3 امجد حیدرآبادی : حیات اور شخصیت

امجدؔ حیدرآبادی کا اصل نام سید احمد حسین تھا۔ وہ ۱۹ مارچ ۱۸۷۸ء کو حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب نیک نام اور نیک کام تھے۔ ان کا نام سید رحیم علی تھا۔ حیدرآباد کے مدرسہ نظامیہ سے انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ عربی اور فارسی زبانوں میں مہارت حاصل کرتے ہوئے انھوں نے اپنی شناخت بنائی۔ امجدؔ حیدرآبادی ابھی ایام طفولیت میں ہی تھے کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے ان کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ امجدؔ کہتے ہیں:

> ''ہماری والدہ کے عزیز و اقارب سب مر چکے تھے۔ شوہر کا سایہ بھی سر پر باقی نہ رہا تھا۔۔۔۔۔ مگر نہ معلوم ہماری ان امی جان میں تعلیم کا شوق کہاں سے اور کس طرح پیدا ہو گیا تھا کہ ہم سے بار بار فرماتیں! بیٹا اگر جینا ہو تو کچھ ہو کر جیو ورنہ مر جاؤ۔ ماں علم کی دلدادہ، ہم کھیل پر آمادہ، ان کو علم سے محبت، ہم کو پڑھنے سے وحشت۔۔۔۔۔ غرض اسی طرح جان چرا چرا کر خانگی طور پر قرآن مجید اور اردو کی دو ایک کتابیں الٹی سیدھی ختم کر لیں۔ جب مدرسے میں شریک ہوئے ان حیلے بہانوں کی چنداں ضرورت نہ پڑی۔ کتابوں کا بستہ بغل میں دب کر شوقین بچے کی طرح گھر سے نکل جاتے۔ باغوں اور جنگلوں کی سیر کیا کرتے اور پھر عصر کے وقت اسی طرح بستہ بغل میں لیے ہوئے گھر واپس آ جاتے۔ آخر ایک دن ہماری والدہ کو ہماری آوارہ گردی کا پتہ چل ہی گیا۔ ایک روز ہمارے دروازے کے سامنے سے کہاروں کے کندھوں پر پالکی میں کوئی امیر سوار جا رہے تھے۔ پالکی پکڑے ہوئے ایک آدمی بھی ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ والدہ نے ہم کو

بلا کر دکھایا اور کہا دیکھو اور اچھی طرح سمجھو۔ ایک آدمی سوار ہے، ایک پیدل پاؤں، پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے۔ بتاؤ ان دونوں میں سے تم کو کس کی زندگی پسند ہے؟ ہم نے کہا پالکی سوار کی۔ والدہ نے کہا ایسی زندگی تو بغیر علم کے کسی کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ اگر نہ پڑھو گے تو تم کو بھی اسی دوسرے آدمی کی طرح پالکی کے ساتھ دوڑنا پڑے گا۔ وقت کی بات گفتگو کا اثر۔ اس بیش بہا مثال سے ہم سہم گئے اور آئندہ کھیلنے سے توبہ کر کے پڑھنے لکھنے کا عہد کرلیا۔''

(یادگار امجدؔ ص ۱۰۔۱۱)

لہٰذا امجدؔ صاحب مدرسہ نظامیہ میں داخل ہو گئے، اس کے بعد مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ان کی شادی اعظم النساء بیگم سے ہوئی۔ ذمہ داریوں کے احساس نے ملازمت کی جانب دھکیلا۔ اتالیق کی حیثیت سے انھوں نے گھر جا کر پڑھانا شروع کیا۔ مستقل معاش کی تلاش میں امجد حیدرآبادی بنگلور چلے گئے۔ وہاں انھیں مشن اسکول میں درس وتدریس کا موقع دیا گیا۔ علاوہ درس تدریس کے امجدؔ حیدرآبادی عیسائی پادریوں سے مذہبی بحثیں بھی کیا کرتے تھے۔ اسی دوران وہ ایک پارسی ڈاکٹر کو فارسی (خاص طور سے شاہنامہ) پڑھانے پر مامور ہوئے۔ معاش کے راستے کھل رہے تھے۔ ایک خیر خواہ کے توسط سے بنگلور کی سٹی ہائی اسکول میں ملازمت حاصل ہوئی۔ اسی ہائی اسکول کے احاطے میں رہنے کا انتظام تھا۔ زندگی ایک خاص ڈھرے پر آ رہی تھی کہ والدہ کی جانب سے بلاوا آ گیا اور امجدؔ حیدرآبادی حیدرآباد واپس آ گئے۔ یہاں انھیں مدرسہ دارالعلوم میں ملازمت مل گئی۔ موسیٰ ندی کا مشہور سیلاب جس نے اس دور میں علاقے کو تہس نہس کر دیا تھا، امجدؔ حیدرآبادی کے خاندان کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ ماں، بیوی، بچی سب سیلاب کی نذر ہو گئے۔ امجد صاحب کی جان بچنی تھی سو بچی۔ تاہم زندگی نئے سرے سے شروع کرنی تھی۔ اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے امجدؔ حیدرآبادی نے ایک رباعی لکھی تھی۔۔۔۔

سیلاب میں جسم زار گویا خس تھا　　عرفات محیط غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجد　　غیرت والے کو ایک چلو بس تھا

امجدؔ حیدرآبادی نے اس سانحے کے چند برس بعد دوسرا نکاح جمال النساء بیگم سے کیا جنھیں شادی کے بعد امجد سلمیٰ کے نام سے پکارنے لگے۔ دونوں کی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ حالات موافق ہوئے تو حج کی سعادت سے یہ جوڑا سرفراز ہوا۔ مگر اس مبارک سفر کے تھوڑے عرصے کے بعد جمال النساء بیگم عرف سلمیٰ کا انتقال ہو گیا اور امجدؔ صاحب

پھر سے تنہائی کے شکار ہو گئے۔ ان کی تنہائی اور مایوسی دیکھ کر دوستوں نے انھیں ایک اور رشتے میں باندھ دیا۔ مگر یہ رشتہ دیر پا نہیں رہا، جلد ہی طلاق کی نوبت آ گئی۔ تاہم ایک مدت کے بعد امجدؔ صاحب نے پھر نکاح کیا اور اسے نبھایا۔

معروف کتاب ''دکن میں اردو'' کے مصنف نصیر الدین ہاشمی اپنے ایک مضمون میں امجدؔ حیدر آبادی کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں ''تیس بتیس سال کے جوان، لمبا قد، چھریرا بدن، گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، ترکی ٹوپی، حیدر آبادی دوہرا پاجامہ، سلیم شاہی چڑھاواں، یہ تھے امجد صاحب۔'' (ایضاً ص۹)

امجدؔ حیدر آبای سادگی پسند تھے، خوددار تھے، مہمان نواز تھے، ریاکار نہ تھے، نام ونمود کی خواہش نہیں تھی۔ امجدؔ کی سادگی ان کے مزاج، رہن سہن اور ان کے روزانہ کے معمول سے عیاں تھی۔ ضروریات کی چیزیں خود خریدنا پسند کرتے تھے۔ کسی کو تکلیف دینا انھیں گوارا نہیں تھا۔ اکثر تنگ دستی رہی، مگر کسی کا احسان مند ہونا ان کی خوددار طبیعت نے منظور نہیں کیا۔ بلکہ استطاعت کے مطابق خود دوسروں کی مدد کرنے میں پہل کرتے تھے۔ امجدؔ صاحب بہت جلد تعلقات نہیں بناتے تھے، مگر جب تعلق قائم ہو جاتا تو اسے نبھانے کی حتی الامکان کوشش کرتے تھے۔ شیخی بگھارنا انھیں پسند نہیں تھا۔ حالانکہ ان کے تعلقات حیدر آباد کی بڑی اور نمایاں شخصیات سے رہے ہیں۔ سر امین جنگ، سر مہدی یار جنگ، سر اکبر حیدری جیسے حکومتی سطح کے لوگ بھی اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (سائنسداں)، ڈاکٹر عبدالحق، محمد اسداللہ (انجینیر)، ڈاکٹر منیر الرحمٰن، ڈاکٹر احمد حسین، خواجہ حمید الدین شاہد، جوش ملیح آبادی، تلوک چند محروم وغیرہ نابغہ روزگار شخصیات ان کے دولت کدے پر حاضر ہوتے، لیکن امجدؔ صاحب نے مرعوب ہونا تو کجا ان ہستیوں سے دنیاوی فوائد تک حاصل نہیں کیے۔ اور نا ہی رسوخ کا ناجائز استعمال کیا۔ وہ ہر ملاقاتی کے ساتھ انکساری اور مروت کا رویہ رکھتے۔ وہ نرم دم گفتگو تھے، سب کی عزت کرتے اور ان سے ملنے والا یہ احساس لے کر اٹھتا کہ امجدؔ صاحب نے مجھے سب سے زیادہ عزت دی ہے۔ اور اس احساس کی دولت سے مالا مال صرف بااثر اشخاص نہیں ہوتے تھے بلکہ بلا امتیاز منصب، فرقہ وحیثیت سب یہی سمجھتے تھے۔

8.4 امجدؔ حیدر آبادی کی رباعی گوئی

امجدؔ حیدر آبادی کی شخصیت اور شاعری میں کئی مشترکہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ان کی رباعیات میں غربت کے تعلق سے تفخرانہ انداز ملتا ہے یا تشکرانہ انداز کی جلوہ فرمائی ہے، ان کی زندگی میں بھی تنگ دستی اور بدحالی کے ایام ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔ نہ تو امجدؔ صاحب نے زندگی میں غربت سے شکایت کی اور نہ ہی شاعری میں اسے نشانہ بنایا، برخلاف اس کے انھوں نے تصوفانہ رنگ دے کر غریبی کو اصل بادشاہی کے روپ میں دکھانا چاہا ہے۔ غم اور مصیبت امجدؔ صاحب کی

حیات مستعار کی لازمی شے بن گئی تھی اور اسے انھوں نے سینے سے لگایا بھی۔ ان کے کلام میں غم والم کی کیفیات کو زندگی کے سرور کے طور پر علامتی انداز کے ساتھ ملبوس کیا گیا ہے۔ ان کی زندگی جس طرح شرافت اور نیک نامی میں گزری ہے، بلاتفریق مذہب وملت ان کے بہتر سلوک کا ہر کوئی مساوی حقدار تھا، وہ انسان کو بحیثیت انسان اور مخلوق خداوندی دیکھتے اور اسی لائق اس کی قدردانی کرتے یعنی ان میں انسانیت کا جوہر نمایاں تھا، اسی طرح ہم ان کے کلام میں انسانیت کو مشتہر کرنے والا مواد وافر مقدار میں پاتے ہیں۔ انسان کی اوقات اور اس کی حیثیت کا ادراک امجدؔ صاحب کو بہت واضح طور پر تھا۔ انھوں نے اپنی بیشتر رباعیوں میں اس موضوع کو بیان کیا ہے۔ پیام امجدؔ، حج امجدؔ، رباعیات امجدؔ، خرقہ امجدؔ، ریاض امجدؔ، حکایات امجدؔ جیسی شعری اور نثری کتابیں امجدؔ حیدرآبادی کی یادگار رہیں۔ مثال کے لیے امجدؔ حیدرآبادی کی چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔

غم سے ترے اپنا دل نہ کیوں شاد کروں — جب تو سنتا ہے، کیوں نہ فریاد کروں
میں یاد کروں تو تو مجھے یاد کرے — تو یاد کرے تو میں نہ کیوں یاد کروں

انسان کی زندگی کی دو سانسیں ہیں — ہر جان کی زندگی کی دو سانسیں ہیں
یہ کلمہ طیبہ کے دو جز و نہیں — ایمان کی زندگی کی دو سانسیں ہیں

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی — طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدے میں خاک کردیا ہستی کو — حضرت! تم سے دیا سلائی اچھی

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے — مضمون بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر باعتبار فن خوب کہا — لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں — پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ، پڑھتے ہیں نماز — کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

ایسی خوبصورت اور بامعنی رباعیاں لکھنے والے امجدؔ حیدرآبادی نے تقسیم ہند کے بعد اپنے ملک ہی میں رہنا پسند کیا اور دکن حیدرآباد کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ امجدؔ صاحب کا انتقال ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ عام روش سے ہٹ کر انھوں نے رباعی کے میدان کو منتخب کیا اور اپنی شناخت قائم کی۔ اردو رباعی اور امجدؔ حیدرآبادی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو گئے ہیں۔

8.5 امجدؔ حیدرآبادی کی رباعیاں اوران کی تشریحات

کس برق کی ہر آن چمک رہتی ہے
کس گل کی دماغ میں مہک رہتی ہے
ٹوٹا ہے ضرور کوئی کانٹا دل کا
جب دیکھیے کچھ کھٹک رہتی ہے

برق اور چمک نیز گل اور مہک، مزید کانٹا اور کھٹک مناسبتیں امجدؔ حیدرآبادی کی شاعرانہ صلاحیت کی گواہی دے رہی ہیں۔ یہ رباعی ایک غیر موجود جذبہ یا شے کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ اوراس کا انداز پہلے دومصرعوں میں سوالیہ ہے اور آخری دومصرعے اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چمک، مہک اور کھٹک تینوں الفاظ معنوی طور پر بھی جداگانہ ساخت کے حامل ہیں۔ تاہم یہ رباعی ان باہم جداگانہ ساخت کے الفاظ میں مناسبت پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔ وہ یوں کہ برق کی چمک یا گل کی مہک اور کانٹے کی کھٹک ان تینوں مناسبتوں کا تعلق دل کے ٹوٹنے سے ہے۔ دل کا کانٹا ٹوٹنا، کسی باطنی خلش یا بے چینی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ چمک اور مہک انبساط اور خوشی کے استعارے ہیں جبکہ کھٹکنا منفی جذبے کی ترجمانی ہے۔ تاہم یہ رباعی ان باہم متضاد استعاروں اور اصطلاحوں میں معنوی ربط پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جو دل کا کانٹا ٹوٹ گیا ہے اور اس کی کھٹک محسوس ہو رہی ہے، آنکھوں میں وہی کھٹک چمک بن جاتی ہے اور دماغ میں مہک بن کر اسے معطر کر دیتی ہے۔ یہاں پہلے دومصرعوں کے سوال ''کس'' کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ تاہم یہ جواب تجریدی ہے، واضح نہیں ہے۔ کیوں کہ شاعر نے تشنگی قائم رکھی ہے ''ضرور کوئی'' اور ''کچھ'' الفاظ راز کو افشاں نہیں ہونے دیتے۔

گردش کیوں کوبہ کو ہے معلوم نہیں
دل کی کیا آرزو ہے معلوم نہیں
جب دیکھیے جستجو میں سرگرداں ہوں
کس چیز کی جستجو ہے معلوم نہیں

امجدؔ حیدرآبادی کی یہ رباعی ایک الجھے ہوئے ذہن کی عکاسی کر رہی ہے۔ غیر متعین مقصد اسی طرح غیر معلوم حرکات کا غماز بن جاتا ہے۔ ذہن کا الجھاؤ نہ سمت سمجھ پاتا ہے، نہ وقت کا احساس رکھتا ہے، نہ کام کی شفافیت اس کے روبرو ہوتی ہے، نہ اسے دن سمجھ آتا ہے اور نہ رات کی تاریکی کا احساس ہو پاتا ہے۔ بس بے سمت اور بے مقصد زندگی رواں دواں ہوتی ہے۔ یہاں جو قافیہ ''معلوم نہیں'' ہے وہ کسی چیز کے جاننے کے لیے نہیں ہے بلکہ ہونے والی حرکات کے اسباب کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے ہے، اور اس معنویت میں اسے سمجھا جانا چاہیے۔ گردش دوراں کیا اور کیوں ہے؟ دل کیا چاہ رہا ہے؟ دل کی آرزو کیا ہے؟ دل میں تمنا کون سی ہے؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔ گردش میں جستجو، دل کی دھڑکن میں جستجو، دماغ میں کیا چل رہا ہے اس کی جستجو۔ غرض نہ دل مطمئن نہ دماغ یکسو۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ امجدؔ حیدرآبادی کا اصل نام کیا تھا؟
۲۔ امجدؔ حیدرآبادی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
۳۔ امجدؔ حیدرآبادی نے منشی فاضل کا امتحان کس تعلیمی ادارے سے پاس کیا؟
۴۔ امجدؔ حیدرآبادی کی پہلی زوجہ کا نام کیا تھا؟
۵۔ امجدؔ حیدرآبادی سلمیٰ نام سے کسے پکارا کرتے تھے؟
۶۔ امجدؔ حیدرآبادی کی شخصیت کو نمایاں کرنے والی دو خصوصیات کا ذکر کیجیے۔
۷۔ امجدؔ حیدرآبادی کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

8.6 یاس یگانہ چنگیزی: حیات اور شخصیت

مغل پورہ عظیم آباد (حال پٹنہ) کے رہنے والے مرزا پیارے اور عزت فاطمہ بیگم کے گھر ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو مرزا واجد حسین تولد ہوئے جو اردو ادب میں یاس یگانہ چنگیزی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی اس کے بعد محمڈن اینگلو عربک اسکول عظیم آباد سے انٹرنس کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں کلکتہ مٹیا برج پہنچے جہاں انھیں شہزادوں کو انگریزی پڑھانے پر مامور کیا گیا۔ عظیم آباد میں رہتے ہوئے یگانہ نے اس وقت کے استاد شعرا بیتاب عظیم آبادی اور شاد عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ انھیں شاعری سے فطری دلچسپی تھی۔ کلکتہ میں مناسب ملازمت ہونے کے باوجود یگانہ زیادہ عرصہ رک نہیں پائے۔ ان کی طبیعت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ کلکتہ کی آب و ہوا انھیں راس نہیں آئی۔ وہاں سے واپس عظیم آباد آئے۔ اس کے بعد ملازمت کے سلسلے میں ان کے سفر کئی شہروں میں ہوتے رہے۔ دہلی، اٹاوہ، علی گڑھ، لاہور، اجمیر، الہ آباد، لکھنو، حیدرآباد۔ انھوں نے رہائش کے لیے لکھنو کا انتخاب کیا، لیکن لکھنو میں مستقل ملازمت انھیں مل نہیں پائی۔ ایک مدرسے میں فارسی پڑھائی، پھر منشی نول کشور کے اودھ اخبار سے جڑے، لکھنو سے ایک رسالہ ''کارامروز'' جاری کیا جو پانچ شماروں کے بعد دم توڑ گیا۔ اس کے بعد اٹاوہ چلے گئے، وہاں ایک اسکول میں بحیثیت مدرس منتخب ہوئے۔ یہیں پر ان کی ملاقات فانی بدایونی سے ہوئی جو دوستی میں بدل گئی تھی۔ اٹاوہ سے یگانہ نے ایک رسالہ ''صحیفہ'' جاری کیا تھا، تاہم اسے بھی جلد ہی بند کرنا پڑا اور کسی وجہ سے نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ یہاں سے اٹھ کر وہ علی گڑھ چلے آئے اور ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' سے وابستہ ہوئے۔ تاہم یہ دور بھی طویل نہیں رہا۔ اور لاہور کی فضا نے یگانہ کو دعوت خاص دے کر اپنا مہمان بنالیا۔ یہاں اردو مرکز کے بچوں کے رسالے ''پریم'' کی ادارت سے وابستہ ہوئے۔ پھر حفیظ جالندھری کی سفارش سے انجمن حمایت الاسلام کے دفتر میں ملازمت حاصل کر لی۔ مولانا حفظ الرحمان منہاس اس دور میں ''اردو انسائیکلوپیڈیا'' پروجیکٹ کے سلسلے میں متحرک تھے۔ انھوں نے یگانہ کو اس پروجیکٹ سے جوڑا۔ انجمن کی ملازمت سے الگ ہو کر یگانہ نے انسائیکلوپیڈیا کے کام میں دلچسپی دکھائی مگر یہ بھی عارضی ہی ثابت ہوئی۔ قسمت نے یگانہ کو حیدرآباد دکن پہنچایا اور اس ریاست کے ایک ضلع عثمان آباد میں بحیثیت سب رجسٹرار کے مستقل ملازم منتخب کر لیے گئے۔ لکھنو میں رہتے ہوئے یگانہ نے کنیز حسین سے نکاح کر لیا تھا۔ یگانہ کو چار بیٹیاں اور تین بیٹے ہوئے۔ انھوں نے عثمان آباد میں ملازمت کرتے ہوئے خاندان کو لکھنو ہی میں رکھا۔ چھٹیوں میں لکھنو آتے۔

یگانہ چنگیزی لکھنو شہر کو پسند کرتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور لکھنو اس وقت شاعروں کی کہکشاں تھا۔ تاہم لکھنو کے شعرا کا مزاج غیر لکھنوی شعرا سے مختلف تھا۔ یگانہ بھی انفرادی مزاج کے مالک تھے۔ انھوں نے غزلیں

لکھیں، رباعیوں میں نام کمایا اور دوسری اصناف شعری میں بھی اپنی موجودگی درج کرائی، تاہم ان کا اپنے تئیں اعلیٰ اور مستند شاعر سمجھنا ان کے لیے کئی جگہوں پر تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ لکھنو ادب و زبان کے اعتبار سے اپنا سکہ جمائے ہوئے تھا اور یہاں کے شعرا و ادبا اپنے انفرادی اسلوب نگارش پر نازاں رہتے تھے، یاس یگانہؔ کا اعتبار کس طرح کر سکتے تھے؟ یگانہؔ مشاعروں میں شامل ہوتے اور بزعم خود تمام لکھنوی شعرا پر حاوی ہو جاتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے کلام میں متاثر کرنے کی جس قدر طاقت ہے اور شان ہے وہ فی زمانہ کسی شاعر میں نہیں ہے، حد تو یہ ہے کہ وہ مرزا غالبؔ تک کو اپنے سے کمتر شاعر آنکنے لگے تھے۔ مرزا غالبؔ کی شہرت کو اندھی تقلید اور اندھی عقیدت مندی سمجھتے تھے۔ اپنے آپ کو غالب شکن کہلوانا پسند کرتے تھے۔ ان کا ایک طویل خط اپنے وقت کے ناقد اور استاد اور یگانہؔ کے دوست پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کے نام ہے جس میں انھوں نے غالبؔ کے کلام پر اعتراضات درج کیے ہیں۔ مسعود حسین رضوی ادیب نے یہ خط ''غالب شکن'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ مرزا یاس یگانہؔ مرزا غالبؔ کی فارسی دانی کے بھی قائل نہیں تھے۔ اسی طرح لکھنوی شعرا کے ساتھ بھی ان کا رویہ رہا۔ عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی، محشر لکھنوی وغیرہ استاد شعرا سے ان کی مخاصمت انھیں لکھنوی اسکول کا مخالف بنا دینے کے لیے کافی تھی۔ یگانہؔ عام روش سے ہٹ کر شاعری کرنے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اپنی اس انفرادیت کو وہ تمام لکھنوی شعرا و ادبا سے منوانا چاہتے تھے۔ لکھنو شعرا کی ایک جماعت تھی جو ''معیار پارٹی'' کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس جماعت کے نمائندہ شعرا نے یگانہؔ کی مخالفت کو لازم بنا لیا تھا۔ یگانہؔ نے اپنی تقریباً ہر کتاب میں معاصر شعرا میں اپنی اہمیت کو مبالغہ کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتابوں میں لکھے ہوئے دیباچے یا مقدمے بھی مشکوک گردانے گئے ہیں۔ خاص طور سے شعری مجموعہ ''آیات وجدانی'' میں لکھا گیا مرزا امراد بیگ چغتائی کا مقدمہ اور ''شہرت کاذبہ المعروف خرافات عزیز'' میں لکھی گئی مولوی غازی الدین بلخی کی تقریظ خود یگانہؔ کے زور قلم کا نتیجہ سمجھی گئی۔ جس میں معاصر شعرا کی خرافات اور یگانہؔ کے شاعرانہ کمالات کا از خود اعتراف کیا گیا تھا۔ ان تحاریر سے لکھنو کے شعرا میں یگانہؔ کے تعلق سے بدگمانی مزید جڑ پکڑنے لگی۔ بعض دفعہ یگانہؔ روایتی مذہبی عقائد کی مخالفت میں بھی کچھ کہہ جاتے تھے۔ جس سے ان کی مخالفت نہ صرف ادبا و شعرا میں بڑھتی گئی بلکہ مذہبی حلقوں اور عوام الناس میں بھی ان کے خلاف ایک رائے بننے لگی تھی۔

مرزا یاس یگانہؔ چنگیزی پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ اپنی تحریروں میں اپنے نام کے ساتھ علیہ السلام لکھنے لگے تھے۔ حد سے بڑھی ہوئی اس تعلیٰ پر مذہبی جماعتیں بھی ان سے خفگی کا اظہار کرنے لگی تھیں۔ یعنی لکھنؤ میں رہتے ہوئے مرزا یاس یگانہؔ نہ صرف ادبی اذہان کو اپنے مخالف بنانے پر تلے ہوئے تھے بلکہ مذہبی رہنماؤں سے بھی دشمنی پیدا کر لی

تھی۔ان کے چند معروضات نے تو ہنگامہ برپا کردیا تھا۔اور یہ ہنگامہ ان کی تضحیک کا باعث بن گیا تھا۔یگانہ کو ان کے دوست پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب متنازعہ تحریروں سے پرہیز کی صلاح دیتے رہے اور ان کا دفاع بھی کرتے رہے۔تاہم یگانہ کے تعلق سے لکھنو میں اشتعال بڑھتا جارہا تھا۔وہ ملازمت سے سبکدوش ہوکر لکھنو ہی میں سکونت پذیر ہوچکے تھے۔تقسیم ہند کے بعد ان کی اہلیہ بچوں کو لے کر لاہور چلی گئی تھیں۔اور خاندان کے کئی لوگ پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔البتہ یگانہ کے ایک ہم زلف مع خاندان لکھنؤ ہی میں رک گئے تھے۔یگانہ لکھنؤ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ایک بار وہ اپنے بیوی بچوں سے ملنے لاہور گئے۔چند دنوں بعد انھیں لکھنؤ کی یاد ستانے لگی اور وہ لکھنؤ واپس آ گئے۔تاہم لکھنؤ کی فضا ان کے خلاف ہوچکی تھی۔سال ۱۹۵۳ء تھا۔ایک دن چند بدمعاش یگانہ کے مطالعہ گاہ میں گھسے، جہاں وہ کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔بدمعاشوں نے کہا ''باہر تشریف لائیے، آپ کا جلوس نکالنا ہے۔'' یگانہ نے منع کردیا کہ ''میں جلسے جلوس پسند نہیں کرتا۔'' بدمعاش انھیں اٹھا کر باہر لے آئے اور ان کے منہ پر سیاہی پوت کر گدھے پر بٹھادیا اور گلی محلوں میں گھمانے لگے، خیر ہوئی کہ پولیس کو اطلاع دی گئی اور پولیس نے آکر یہ تماشا ختم کردیا۔مگر اس واقعہ نے لکھنو کی تہذیب اور شرافت کو داغدار کردیا اور یگانہ کی شخصیت کو مسخ کرنے کا کام بھی کیا۔اس واقعہ کے بعد یگانہ کو رضوی ادیب نے اپنے مکان میں پناہ دی۔چند دنوں وہ وہاں رہے پھر اپنے مکان میں اٹھ آئے۔یگانہ اب گوشہ نشیں ہوگئے تھے۔ان کی شخصیت کو متنازعہ بنادیا گیا تھا۔نہ تو انھیں ادبی نشستوں میں عزت کی نگاہ حاصل ہوئی اور نہ ہی مذہبی حلقوں میں ان کے وقار کا بھرم قائم رہ سکا۔تاہم وہ اپنے اصولوں پر، اپنی باتوں پر، اپنے خیالات پر، اپنے کلام پر، اپنی تحریروں پر قائم رہے۔وہ جس بات کو درست سمجھتے تھے اس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔اتنا بڑا حادثہ گزرنے کے بعد بھی ان کی زبان شکایت کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔وہ ہمت و حوصلے کی شاعری کرتے تھے اور خود اعتمادی کے جوہر سے خود بھی متصف تھے۔

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

''آیات وجدانی'' (شعری مجموعہ)، ''گنجینہ'' (غزلوں کا مجموعہ)، ''ترانہ'' (رباعیوں کا مجموعہ)، ''نشتر یاس'' (شعری مجموعہ) اور ''چراغ سخن'' (عروض وقوافی پر مبنی کتاب) جیسی تصانیف مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی ادبی حیثیت کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔گندمی رنگ، اوسط قد، لمبی لمبی مونچھیں، ڈھیلے ڈھالے کپڑے، غرارہ دار پائجامہ، کالی بالوں والی ایرانی ٹوپی اور آنکھوں پر عینک سجانے والے مرزا واجد حسین عرف یاس یگانہ چنگیزی ۴ فروری

۱۹۵۶ء کولکھنو میں اپنے مکان میں انتقال کر گئے۔ چونکہ عوام الناس میں ان کی شبیہہ نہایت منفی بن چکی تھی۔ان کی میت میں بمشکل دس بارہ لوگ ہی شامل ہو پائے تھے۔

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

8.7 یاس یگانہؔ کی رباعی گوئی

اردو رباعی کی تاریخ میں یاس یگانہؔ چنگیزی کا ذکر خاص طور پر ان کی باغیانہ موضوعات اور منفرد اسلوب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ان کی شخصیت کی بے باکی اور خیالات کی وسعت ان کی رباعیوں میں بھی جھلکتی ہے۔

مرا خدا کچھ اور ہے

درد اپنا کچھ اور ہے دوا ہے کچھ اور
ٹوٹے ہوئے دل کا آسرا ہے کچھ اور
ایسے ویسے خدا تو بہترے ہیں
میں بندہ ہوں جس کا وہ خدا ہے کچھ اور

تیسرا مصرعہ زندگی کے مختلف شعبہ جات میں ذرا سی کامیابی پر آسمان کا ستارہ سمجھنے والوں کی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ یاس یگانہؔ چنگیزی منفرد راہ اختیار کرنے والے شخص و شاعر تھے۔''ہے کچھ اور'' قافیہ ان کے اسی انفرادی رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ درد اور غم جداگانہ ساخت اور کیفیت کے ہو سکتے ہیں۔کسی کا درد کم شدت رکھتا ہو، اور کسی کا زیادہ شدید ہوسکتا ہے۔اسی طرح ٹوٹے ہوئے دل کے آسرے بھی مختلف النوع یا مختلف الکیفیت ہو سکتے ہیں، چنانچہ یگانہؔ کی اس رباعی کے شروعاتی دو مصرعے انھیں عام شاعروں کی صف میں شمار کراتے ہیں۔مگر آخر کے دو مصرعے ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں اور انھیں عام شاعروں سے ممتاز کر دیتے ہیں۔''ایسے ویسے خدا'' کا فقرہ یا ٹکڑا یگانہؔ کی طبع کے عین موافق ہے۔ یگانہؔ نے زندگی میں ان پر مسلط کیے جانے والے کئی سروں کا مشاہدہ کیا تھا اور ان کی مخالفت میں ذلت کے گھونٹ بھی پیے تھے، تاہم یگانہؔ نے ایسے ویسے خدؤں کو خود پر حاوی ہونے کبھی نہیں دیا۔ کیوں کہ ''میں بندہ ہوں جس کا وہ خدا ہے کچھ اور'' ان کا یقین تھا۔

دل کے موضوع پر یگانہ نے کئی رباعیاں لکھی ہیں۔زندہ دل، مردہ دل، دل کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔اسی طرح دنیا کے موضوع پر بھی ان کی کئی رباعیاں ہیں۔ دنیا کا مارا پانی نہ مانگے، بے وفا دنیا، دنیا فانی یگانہ باقی وغیرہ وغیرہ۔ ہر کمالے را زوالے، حسن دوروزہ، کھویا نہیں تو پایا معلوم، زمانے کا دھارا، پھول نہیں کانٹے ہی سہی جیسی مختلف فلسفہ اساس رباعیاں بھی مطالعے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یگانہ نے اپنی رباعیوں میں متنوع فلسفیانہ نکات بیان کیے ہیں۔

8.8 یاس یگانہ چنگیزی کی رباعیاں اوران کی تشریحات

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تیری حیاتِ فانی کیا ہے
جھونکا کھانے اور سنبھلتے رہنے کے سوا

زندگی کا فلسفہ کیا ہے؟ مختلف نظریات بیان کیے جا چکے ہیں۔ یگانہ چنگیزی کی یہ رباعی بھی ایک فلسفے کی ترجمان ہے۔زندگی کو جلتی ہوئی شمع کے روپ میں سمجھنا اوراس شمع کی کیفیت کو زندگی کے حالات سے مطابقت دینا یگانہ کے لیے ایک نیا تجربہ تھا اور اردو رباعی کے لیے بھی۔ ہوا آتی ہے تو شمع کی بجھنے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، شاعر نے اسے جھونکا کھانے سے تعبیر کیا ہے اور جب ہوا کے گزرنے کے بعد شمع کی لو تیز اور ساکن ہو جاتی ہے تو اسے سنبھلنے کی معنی میں سمجھا یا گیا ہے۔ تاہم ایک وقت آتا ہے کہ شمع فنا کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے، بجھ جاتی ہے۔اسی طرح زندگی بھی تمام موافق اور ناموافق حالات کے مقابلے کے بعد بالآخر فانی ہی ہے، ختم ہو جاتی ہے۔تو گویا زندگی کے موافق اور غیر موافق حالات شمع کے جھونکا کھانے، سنبھلنے اور پھر بجھ جانے کی مانند ہیں۔شمع کا جلنا زندگی کا استعارہ ہے۔

موجوں سے لپٹ کے پار اترنے والے
طوفانِ بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس چلا تو جان پر کھیل گئے
کیا چال ہے ڈوب مرنے والے

یہ رباعی یگانہؔ کی ذاتی زندگی کے واقعات سے مماثلت رکھتی ہے۔ یگانہؔ نے جس طرح نامساعد حالات کا سامنا کیا ہے، جس طرح کی تضحیک اور توہین برداشت کی ہے اور اس کے بعد بھی اپنی چال کو اس ڈھرے پر رکھا جو انھیں پسند تھی، ان کی ہمت کی دلیل بن جاتی ہے۔ موج جو موت کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے اور جس کی چپیٹ میں آنے پر بڑی مشکل سے کوئی زندہ نکل سکتا ہے، پہلا مصرعہ اسی موج کی چپیٹ یا لپٹ میں آنے کے بعد اسی کے ذریعے زندہ سلامت باہر نکل جانے کی بات بتا رہا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ موجوں میں گھرنے کے بعد شاعر نے طوفان بلا سے ڈر محسوس نہیں کیا بلکہ اس کا دیوانہ وار مقابلہ کیا اور بالآخر پار اتر گئے یعنی منزل مقصود پا گئے۔ یہاں ڈوب مرنے والے اور جان پر کھیل جانے والے کی بات تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں کی گئی ہے، وہ یوں کہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت پار اترنے کی کوشش میں ، غیر موافق حالات میں دلیرانہ جسارت کرنے کے باوجود قسمت کا لکھا ہو جاتا ہے اور موت مقدر بن جاتی ہے۔ تاہم یہ موت بھی اپنے ساتھ حوصلہ کی کہانی دنیا کو دے جاتی ہے۔ جان پر کھیلنا، طوفان بلا سے نہ ڈرنا یہ انداز یگانہؔ چنگیزی کی شخصیت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ زندگی کے لیے موت لازمی ہے تو اس سے خوف کھانا کیا معنی؟ بہادری سے جینا اور بہادری سے مرنا مردِ آزاد کا شیوہ ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ یاس یگانہؔ چنگیزی کا اصل نام کیا تھا؟

۲۔ یاس یگانہؔ چنگیزی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۳۔ یاس یگانہؔ چنگیزی کے والدین کے نام کیا ہیں؟

۴۔ یاس یگانہؔ چنگیزی منشی نولکشور کے کس اخبار سے منسلک رہے؟

۵۔ یاس یگانہ چنگیزی کو مستقل ملازمت کہاں ملی؟

۶۔ یاس یگانہ چنگیزی کے ایک شعری مجموعے کا نام لکھیے۔

۷۔ لکھنو کے شعرا کی جماعت کا نام کیا تھا؟

۸۔ یاس یگانہ چنگیزی کی وفات کب اور کہاں ہوئی؟

8.9 خلاصہ

صنف رباعی اردو شاعری کی پسندیدہ اور مقبول صنف ہے۔ تاہم اس صنف میں شہرت بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی۔ ان خوش قسمت شاعروں میں امجد حیدرآبادی اور یگانہ چنگیزی کے نام نمایاں ہیں۔ حالانکہ ان شعرا نے دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ خاص طور سے یگانہ نے اردو غزل میں بھی اپنا مقام بنایا۔ مگر امجد حیدرآبادی کی پہچان ان کی رباعیاں ہی رہیں۔ انھوں نے مختلف فلسفیانہ حکمتیں اپنی رباعیوں میں بیان کی ہیں۔ رباعی گوئی میں ان کے تجربے نادر و انوکھے تھے۔ آسان اور سادہ زبان اور اعلیٰ معنوی جہتیں ان کی رباعیوں کی خصوصیات ہیں۔ جس طرح امجد حیدرآبادی کی زندگی شریفانہ اور متاثر کن گزری، ان کی رباعیاں بھی متاثر کن رہی ہیں۔ یگانہ چنگیزی متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے اصول وضوابط خود بنائے بلکہ سماج سے مخالفت بھی کی ہے۔ ان کی شاعری ہنگامہ خیز مگر حوصلوں سے بھرپور رہی ہے۔ یہاں مایوسیوں کا گزر نہیں۔ انھوں نے اپنے بل پر زندگی جی اور شاعری کی۔ ان کا کلام ان کے تخیلات کا آئینہ دار ہے۔ اردو رباعی اور منجملہ اردو شاعری کی تاریخ امجد حیدرآبادی اور یگانہ چنگیزی کے ذکر اور کلام کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔

8.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

1۔ یاس یگانہ چنگیزی کی رباعی گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ امجد حیدرآبادی کی رباعی گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

ب۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے مفصل جوابات لکھیے۔

1۔ امجد حیدرآبادی کی حیات اور شخصیت پر معلوماتی مضمون قلم بند کیجیے۔

2۔ یاس یگانہ چنگیزی کی حیات اور شخصیت پر معلوماتی مضمون قلم بند کیجیے۔

ج۔ مع سیاق سباق رباعی کی تشریح کیجیے۔

1۔ گردش کیوں کو بہ کو ہے معلوم نہیں
دل کی کیا آرزو ہے معلوم نہیں
جب دیکھیے جستجو میں سرگرداں ہوں
کس چیز کی جستجو ہے معلوم نہیں

2۔ موجوں سے لپٹ کے پار اترنے والے
طوفانِ بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس چلا تو جان پر کھیل گئے
کیا چال ہے ڈوب مرنے والے

8.11 فرہنگ

تضحیک	ہنسی اڑانا، توہین
تقریظ	کتاب اور مصنف کی تعریف
اتالیق	استاد
استطاعت	طاقت، بساط
اعتراف	اقرار
آگاہی	خبر، واقفیت، علم
حدت	تیزی، جوش
دلدادہ	چاہنے والا، عاشق
تفخرانہ	فخر کے ساتھ، گھمنڈ کے ساتھ
بزعم	گمان کے ساتھ
وحشت	ڈر، خوف، جنون، نفرت

فراغت	فرصت،نجات
مشکوک	شک کیا گیا،گمان کیا گیا
نازاں	ناز کرنے والا،فخر کرنے والا
یکتائے روزگار	لاجواب، بے مثل
مامور	متعین،مقرر
ثروت مند	دولت مند
کفالت	ذمہ داری،ضمانت
شرف تلمذ	شاگردی کا شرف
متمول	مال دار، دولت مند
اضطراب	بے چینی، بے قراری
ودیعت	سپردگی،امانت
قنوطیت	ناامیدی،مایوسی
اختلاج قلب	ایک مرض جس میں دل زورزور سے دھڑکتا ہے
مضمحل	اداس،غم زدہ

8.12 کتابیات

۱۔ رباعیات امجدؔ — امجدؔ حیدرآبادی

۲۔ یادگار امجدؔ — محمد اکبرالدین صدیقی (مرتب)

۳۔ کلیات امجدؔ حیدرآبادی — امجدؔ حیدرآبادی

۴۔ غالب شکن — پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب (مرتب)

۵۔ رباعیات امجدؔ حیدرآبادی کا موضوعی تناظر — ڈاکٹر قطب سرشار

۶۔ پیام امجدؔ — سید امجد حسین امجدؔ

۷۔	ارمغان امجدؔ	خواجہ حمید الدین شاہد (مرتب)
۸۔	انتخاب یگانہؔ	شعیب نظام (مرتب)
۹۔	مرزا یاس یگانہؔ چنگیزی: حیات اور شاعری	تمثیل احمد
۱۰۔	یگانہؔ: احوال و آثار	نیر مسعود
۱۱۔	مکتوبات یگانہؔ	وسیم فرحت کارنجوی (مرتب)
۱۲۔	یاس یگانہؔ چنگیزی	راہی معصوم رضا

☆☆☆

نصاب

(حصہ دوم)

حصہ نثر :

۱۔	ایک خدا پرست شہزادی	میر امن دہلوی	(داستان)
۲۔	اخلاق	سر سید احمد خان	(انشائیہ)
۳۔	نصوح کی بیماری	ڈپٹی نذیر احمد	(ناول)
۴۔	نام دیو مالی	مولوی عبدالحق	(خاکہ)
۵۔	الیکشن	رشید احمد صدیقی	(انشائیہ)
۶۔	دو فرلانگ لمبی سڑک	کرشن چندر	(افسانہ)

حصہ نظم :

(الف) غزلیات :

۱۔	میر تقی میر	۲۔	خواجہ میر درد	۳۔	مرزا داغ دہلوی
۴۔	مرزا محمد رفیع سودا	۵۔	مرزا غالب	۶۔	شاد عظیم آبادی

(ب) نظمیں :

۱۔	مفلسی	نظیر اکبر آبادی
۲۔	صبح شہادت	میر انیس
۳۔	نشاط امید	الطاف حسین حالی
۴۔	نصیحت اخلاق	اکبر الہ آبادی
۵۔	گوپال کرشن گوکھلے	چکبست
۶۔	کوہستان دکن کی عورت	جوش ملیح آبادی

(ج) رباعیات :

۱۔ امجد حیدر آبادی
۲۔ یاس یگانہ چنگیزی

☆☆☆

میر امن دہلوی

ایک خدا پرست شہزادی

سن اے جوانِ دانا! سلطان اس اقلیم کا بڑا بادشاہ تھا۔ان کے گھر میں سات بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ایک روز بادشاہ نے جشن فرمایا، یے ساتوں لڑکیاں سولہ سنگار، بارہ ابھرن، بال بال گج موتی پروکر بادشاہ کے حضور میں کھڑی تھیں۔ سلطان کے کچھ جی میں آیا تو بیٹیوں کی طرف دیکھ کر فرمایا: اگر تمھارا باپ بادشاہ نہ ہوتا اور کسی غریب کے گھر تم پیدا ہوتیں تو تمھیں بادشاہ زادی اور ملکہ کون کہتا! خدا کا شکر کرو کہ شہزادیاں کہلاتی ہو۔تمھاری یہ ساری خوبی میرے دم سے ہے۔

چھے لڑکیاں ایک زبان ہوکر بولیں کہ جہاں پناہ جو فرماتے ہیں، بجاہے اور آپ ہی کی سلامتی سے ہماری بھلائی ہے، لیکن یہ ملکۂ جہاں سب بہنوں سے چھوٹی تھیں، پر عقل وشعور میں اس عمر میں بھی گویا سب سے بڑی تھیں، چپکی کھڑی رہیں، اس گفتگو میں بہنوں کی شریک نہ ہوئیں، اس واسطے کہ یہ کلمہ کفر کا ہے۔ پادشاہ نے نظر غضب سے ان کی طرف دیکھا اور کہا: کیوں بی بی! تم کچھ نہ بولیں، اس کا کیا باعث ہے؟ تب ملکہ نے دونوں ہاتھ اپنے رومال سے باندھ کر، عرض کی کہ اگر جان کی امان پاؤں اور تقصیر معاف ہو تو یہ لونڈی اپنے دل کی بات گزارش کرے۔حکم ہوا کہ کہہ، کیا کہتی ہے؟ تب ملکہ نے کہا کہ قبلۂ عالم! آپ نے سنا ہے کہ سچی بات کڑوی لگتی ہے، سو اس وقت میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر عرض کرتی ہوں اور جو کچھ میری قسمت میں لکھنے والے نے لکھا ہے، اس کا مٹانے والا کوئی نہیں، کسو طرح نہیں ٹلنے کا ؎

خواہ تم پانو گھسو یا کہ رکھو سر بسجود
بات پیشانی کی جو کچھ ہے، سو پیش آتی ہے

جس پادشاہ علی الاطلاق نے آپ کو بادشاہ بنایا، انھیں نے مجھے بادشاہِ زادی کہوایا۔اس کی قدرت کے کارخانے میں کسو کا اختیار نہیں چلتا۔آپ کی ذات ہماری ولی نعمت اور قبلہ و کعبہ ہے۔حضرت کے قدم مبارک کی خاک کو اگر سرمہ کروں تو بجا ہے، مگر نصیب ہر ایک کے، ہر ایک کے ساتھ ہیں۔

بادشاہ یہ سن کر طیش میں آئے اور یہ جواب دل پر سخت گراں معلوم ہوا، بیزار ہو کر فرمایا: چھوٹا منہ بڑی بات! اب اس کی یہی سزا ہے کہ گہنا پاتا جو کچھ اس کے ہاتھ، گلے میں ہے، اتار لو اور ایک میانے میں چڑھا کر، ایسے جنگل میں کہ جہاں نام و نشان آدمی آدم کا نہ ہو، پھینک آؤ۔دیکھیں اس کے نصیبوں میں کیا لکھا ہے۔

بہ موجب حکم پادشاہ کے، اس آدھی رات میں (کہ عین اندھیری تھی) ملکہ کو (جو جونرے بھونرے میں پلی تھیں اور سوائے اپنے محل کے دوسری جگہ نہ دیکھی تھی) بھوئی، لے جا کر ایک میدان میں کہ وہاں پرندہ پر نہ مارتا، انسان کا تو کیا ذکر ہے، چھوڑ کر چلے آئے۔ ملکہ کے دل پر عجب حالت گزرتی تھی کہ ایک دم میں کیا تھا اور کیا ہو گیا! پھر اپنے خدا کی جناب میں شکر کرتیں اور کہتیں: تو ایسا ہی بے نیاز ہے۔ جو چاہا، سو کیا اور جو چاہتا ہے۔ سو کرتا ہے اور جو چاہے گا، سو کرے گا۔ جب تلک نتھوں میں دم ہے، تجھ سے نا امید نہیں ہوتی۔ اسی اندیشے میں آنکھ لگ گئی۔ جس وقت صبح ہونے لگی، ملکہ کی آنکھ کھل گئی، پکاریں کہ وضو کو پانی لانا، پھر ایک بارگی رات کی بات چیت یاد آ گئی کہ تو کہاں اور یہ بات کہاں! یہ کہہ کر، اُٹھ کر تیمم کیا اور دوگانہ شکر کا پڑھا۔ اے عزیز! ملکہ کی اس حالت کے سننے سے چھاتی پھٹتی ہے۔ اس بھولے بھالے جی سے پوچھا چاہیے کہ کیا کہتا ہوگا۔

سچ ہے جب کچھ بن نہیں آتا، تب خدا ہی یاد آتا ہے۔ نہیں تو اپنی اپنی تدبیر میں ہر ایک لقمان اور بوعلی سینا ہے۔ اب خدا کے کارخانے کا تماشا سنو۔ اسی طرح تین دن رات صاف گزر گئے کہ ملکہ کے منہ میں ایک کھیل بھی اُڑ کر نہ گئی۔ وہ پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور وہ رنگ جو کندن سا ملکتا تھا، ہلدی سا بن گیا۔ منہ میں پھیپھڑی بندھ گئی، آنکھیں پتھرا گئیں، مگر ایک دم اٹک رہا تھا کہ وہ آتا جاتا تھا۔ جب تلک سانس، تب تلک آس۔ چوتھے روز صبح کو ایک درویش خضر کی سی صورت، نورانی چہرہ، روشن دل، آ کر پیدا ہوا، ملکہ کو اس حالت میں دیکھ کر بولا: اے بیٹی! اگر چہ تیرا باپ بادشاہ ہے لیکن تیری قسمت میں یہ بھی بدا تھا۔ اب اس فقیر بوڑھے کو اپنا خادم سمجھ اور اپنے پیدا کرنے والے کا رات دن دھیان رکھ، خدا خوب کرے گا۔ اور فقیر کے کچکول میں جو ٹکڑے بھیک کے موجود تھے، ملکہ کے روبرو رکھے اور پانی کی تلاش میں پھرنے لگا۔ دیکھا تو ایک کنواں تو ہے، پر ڈول رسّی کہاں، جس سے پانی بھرے؟ تھوڑے پتّے درخت سے توڑ کر دونا بنایا اور اپنی تھیلی کھول کر اس میں باندھ کر نکالا اور ملکہ کو کچھ کھلایا پلایا۔ بارے ٹک ہوش آیا۔ اس مردِ خدا نے بے کس اور بے بس جان کر بہت سی تسلی دی۔ خاطر جمع کی اور آپ بھی رونے لگا۔ ملکہ نے جب غم خواری اور دل داری اس کی بے حد دیکھی، تب ان کے بھی مزاج کو استقلال ہوا۔ اس روز سے اس پیر مرد نے یہ مقرر کیا کہ صبح کو بھیک مانگنے کے لیے شہر میں نکل جاتا جو ٹکڑا پارچہ پاتا، ملکہ کے پاس لے آتا اور کھلاتا۔

اس طور سے تھوڑے روز گزرے۔ ایک دن ملکہ نے تیل سر میں ڈالنے اور کنگھی چوٹی کرنے کا قصد کیا۔ جوں ہی مباف کھولا، چٹلے میں سے ایک موتی کا دانہ گول آبدار نکل پڑا۔ ملکہ نے اس درویش کو دیا اور کہا: شہر میں سے اس کو بیچ لاؤ۔ وہ فقیر اس گوہر کو بیچ کر اس کی قیمت پادشاہ زادی کے پاس لے آیا۔ تب ملکہ نے حکم دیا کہ ایک مکان موافق گزران کے اس جگہ بنواؤ۔ فقیر نے کہا: اے بیٹی! نیو دیوار کی کھود کر، تھوڑی سی مٹی جمع کرو۔ ایک دن میں پانی لا کر، گارا کر کر گھر کی

بنیاد درست کردوں گا۔ ملکہ نے اس کے کہنے سے مٹی کھودنی شروع کی۔ جب ایک گز عمیق گڑھا کھودا گیا، زمین کے نیچے سے ایک دروازہ نمودار ہوا۔ ملکہ نے اس در کو صاف کیا۔ ایک بڑا گھر جواہر اور اشرفیوں سے معمور نظر آیا۔ ملکہ نے پانچ چار لپ اشرفیوں کی لے کر پھر بند کیا اور مٹی دے کر اوپر سے ہموار کر دیا۔ اتنے میں فقیر آیا۔ ملکہ نے فرمایا کہ راج اور معمار کاری گر اور اپنے کام کے استاد اور مزدور جلد دست بلاؤ جو اس مکان پر ایک عمارت پادشاہانہ کہ طاق کسریٰ کا جفت ہو، اور قصر نعمان سے سبقت لے جائے اور شہر پناہ اور قلعہ اور باغ اور باؤلی اور ایک مسافر خانہ کہ لاثانی ہو، جلد تیار کریں لیکن نقشا ان کا ایک کاغذ پر درست کر کے حضور میں لاویں جو پسند کیا جاوے۔

فقیر نے ایسے ہی کارکن، کارکردہ ذی ہوش لاکر حاضر کیے۔ موافق فرمانے کے، تعمیر عمارت کی ہونے لگی۔ اور نوکر چاکر ہر ایک کارخانہ جات کے خاطر چن چن کر فہمیدہ اور بادیانت ملازم ہونے لگے۔ اس عمارت عالی شان کی تیاری کی خبر رفتہ رفتہ پادشاہ ظل سبحانی کو (جو قبلہ گاہ ملکہ کے تھے) پہنچی، سن کر بہت متعجب ہوئے اور ہر ایک سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جس نے یہ محلات بنانے شروع کیے ہیں؟ اس کیفیت سے کوئی واقف نہ تھا جو عرض کرے، سبھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ کوئی غلام نہیں جانتا کہ اس کا بانی کون ہے؟ تب پادشاہ نے ایک امیر کو بھیجا اور پیغام دیا کہ میں ان مکانوں کے دیکھنے کو آیا چاہتا ہوں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کہاں کی پادشاہ زادی ہو اور کس خاندان سے ہو۔ یہ سب کیفیت دریافت کرنی اپنے تئیں منظور ہے۔

جوں ہی ملکہ نے یہ خوش خبری سنی، دل میں بہت شاد ہو کر عرضی لکھی کہ جہاں پناہ سلامت حضور کے تشریف لانے کی خبر، طرف غریب خانے کے، سن کر نہایت خوشی حاصل ہوئی اور سبب حرمت اور عزت اس کم ترین کا ہوا۔ زہے طالع اس مکان کے! کہ جہاں قدم مبارک کا نشان پڑے اور وہاں کے رہنے والوں پر دامن دولت سایہ کرے اور نظر توجہ سے وے دونوں سرفراز ہویں۔ یہ لونڈی امیدوار ہے کہ کل روز پنج شنبہ روز مبارک ہے اور میرے نزدیک بہتر روز نوروز سے ہے، آپ کی ذات مشابہ آفتاب کے ہے، تشریف فرما کر اپنے نور سے اس ذرے بے مقدار کو قدر و منزلت بخشیے اور جو کچھ اس عاجزہ سے میسر ہو سکے نوش جان فرمایئے۔ یہ عین غریب نوازی اور مسافر پروری ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔ اور اس عمدہ کو بھی کچھ تواضع کر کر، رخصت کیا۔

بادشاہ نے عرضی پڑھی اور کہلا بھیجا کہ ہم نے تمھاری دعوت قبول کی، البتہ آویں گے۔ ملکہ نے نوکروں اور سب کاروباریوں کو حکم کیا کہ لوازمہ یافت کا ایسے سلیقے سے تیار ہو کہ پادشاہ دیکھ کر اور کھا کر محفوظ ہوں اور ادنا اعلا جو پادشاہ کی رکاب میں آویں، سب کھا پی کر خوش ہو کر جاویں۔ ملکہ کے فرمانے اور تاکید کرنے سے سب قسم کے کھانے سلونے اور میٹھے اس ذائقے کے تیار ہوئے کہ اگر باہمن کی بیٹی کھاتی تو کلمہ پڑھتی۔ جب شام ہوئی، پادشاہ منڈے تخت پر سوار ہو کر

ملکہ کے مکان کی طرف تشریف لائے۔ ملکہ اپنی خاص خواص سہیلیوں کو لے کر استقبال کے واسطے چلیں۔ جوں پادشاہ کے تخت پر نظر پڑی، اس آداب سے مجرا شاہانہ کیا کہ یہ قاعدہ دیکھ کر پادشاہ کو اور بھی حیرت نے لیا اور ایک سو ایک کشتی جواہر اور اشرفی اور پشمینہ اور نور بانی اور طلا بافی اور زردوزی کی لگا رکھی تھی، اور دو زنجیر فیل اور دس راس اسپ عراقیی اور یمینی مرضع کے ساز سے تیار کر رکھے تھے، نذر گزارنے اور آپ دونوں ہاتھ باندھے روبرو کھڑی رہیں۔ پادشاہ نے بہت مہربانی سے فرمایا کہ تم کس ملک کی شہزادی ہو، اور یہاں کس صورت میں آنا ہوا؟

ملکہ نے آداب بجالا کر التماس کیا کہ یہ لونڈی وہی گنہ گار ہے جو غضب سلطانی کے باعث اس جنگل میں پہنچی اور یہ سب تماشے خدا کے ہیں جو آپ دیکھتے ہیں۔ یہ سنتے ہی پادشاہ کے لہو نے جوش مارا، اٹھ کر محبت سے گلے لگایا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے تخت کے پاس کرسی بچھوا کر حکم بیٹھنے کا کیا۔ لیکن پادشاہ حیران و متعجب بیٹھے تھے، فرمایا کہ پادشاہ بیگم کو کہو کہ پادشاہ زادیوں کو اپنے ساتھ لے کر جلد آویں۔ جب وے آئیں، ماں بہنوں نے پہنچانا اور گلے مل کر روئیں اور شکر کیا۔ ملکہ نے اپنی والدہ چھہوں ہمشیروں کے روبرو اتنا کچھ نقد اور جواہر رکھا کہ خزانہ تمام عالم کا اس کے پاسنگ میں نہ چڑھے۔ پھر پادشاہ نے سب کو ساتھ بٹھا کر خاصہ نوش جان فرمایا۔

جب تلک جہاں پناہ جیتے رہے، اسی طرح گزری۔ کبھو کبھو آپ آتے اور کبھی ملکہ کو بھی اپنے ساتھ محلوں میں لے جاتے۔ جب پادشاہ نے رحلت فرمائی، سلطنت اس اقلیم کی ملکہ کو پہنچی کہ ان کے سوا دوسرا کوئی لائق اس کام کے نہ تھا۔

☆☆☆

سرسید احمد خاں

اخلاق

مسٹر ایڈیسن کا قول ہے کہ مذہب کے دو حصے ہو سکتے ہیں ایک اعتقادیات، دوسرا عملیات۔ مسٹر ایڈسن کی غرض اعتقادیات سے صرف وہ مسائل ہیں جو وحی سے معلوم ہوئے ہیں اور جو عقل سے یا کارخانۂ قدرت پر غور کرنے سے معلوم نہیں ہو سکتے، مگر ہم کو اِن کے اس بیان سے اس قدر اختلاف ہے۔ ہم اعتقادیان ۔۔۔۔ ان مسائل کو کہتے ہیں جن کا ہونا عقل و نیچر، یعنی کارخانہ قدرت کے اصول پر ناممکن نہیں ہے، الا ہم ان دونوں کی بنا پر اُن کے ہونے کا یقین نہیں کر سکتے تھے، وحی نے صرف ان کے ہونے پر جب وہ ہوں ہم کو یقین دلایا ہے یا ان کا ہونا بتلایا ہے۔ ہم نے اس مقام پر حرف تردید کو اس لے استعمال کیا ہے کہ ہم کو اس بات میں شبہ ہے کہ ان مسائل پر جن کو ہم نے اعتقادیات میں داخل کیا ہے یقین لانا جزو ایمان ہے یا نہیں۔ عملیات میں مسٹر ایڈسن نے اس مسائل کو داخل کیا ہے جن کی عقل و نیچر کے مطابق مذہب نے بھی ہدایت کی ہے۔ پس وہ پہلے کا نام عقائد رکھتے ہیں اور دوسرے حصے کا نام اخلاق۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ وہ اکثر لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اعتقادیات پر اس قدر خیال کرتے ہیں کہ اخلاق کو بلکل بھول جاتے ہیں اور بعضے اخلاق پر ایسے متوجہ ہوتے ہیں کہ اعتقادیات کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ صاحب کمال آدمی کو ان دونوں میں سے کسی بات میں ناقص نہ رہنا چاہیے۔ جو لوگ اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ہر ایک سے کیا کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ دل سے ہمارے اس بیان کی تصدیق کریں گے۔

افسوس ہے کہ اس مقام پر بھی مجھ کو مسٹر ایڈسن سے کچھ تھوڑا سا اختلاف ہے۔ پچھلا حصہ ان کے اس مضمون کا نہایت سچ ہے، مگر پہلے حصے میں کچھ غلطی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعتقادیات میں اور عملیات میں جس کو مسٹر ایڈیسن اخلاق کہتے ہیں کچھ علاقہ نہیں ہے۔ انسان اعتقادیات پر کتنا ہی زیادہ خیال کرے اس کے اخلاق میں کچھ تفاوت نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اخلاق پر کیسا ہی متوجہ ہو اس کے اعتقادیات میں کچھ نقصان نہیں آسکتا، کیوں کہ یہ دونوں کام دو جدا جدا آلوں اور دو جدا جدا شخصوں سے متعلق ہیں، پہلا ہمارے دل یا روح اور خدا سے، دوسرا ہماری ظاہری حرکات اور جذبات اور انسان سے۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ گو مذہب، اخلاق اور اعتقاد پر منقسم ہے اور ان دونوں میں خاص خاص خوبیاں ہیں، مگر اخلاق کو اعتقاد پر اکثر باتوں میں ترجیح ہے۔

(۱) کیونکہ اخلاق کی اکثر باتیں نہایت صحیح اور بہت مضبوط ہیں، یہاں تک کہ اگر اعتقاد بلکل قایم نہ رہیں تب بھی وہ باتیں (یعنی اخلاق کے مسائل) بدستور قائم رہتی ہیں۔

(۲) جس شخص میں اخلاق ہے اور اعتقاد نہیں وہ شخص بہ نسبت اس شخص کے جس میں اعتقاد ہے اور اخلاق نہیں انسان کے لے دنیا میں بہت زیادہ بہتری کرسکتا ہے اور میں اس قدر اور زیادہ کہتا ہوں کہ انسان کے لے دین و دنیا دونوں میں بہت زیادہ بھلائی کرسکتا ہے۔

(۳) اخلاق انسان کی فطرت کو زیادہ کمال بخشتا ہے، کیونکہ اس سے دل کو قرار و آسودگی ہوتی ہے، دل کے جذبات اعتدال پر رہتے ہیں اور ہر ایک انسان کی خوشی کو ترقی ہوتی ہے۔

(۴) اخلاق میں ایک نہایت زیادہ فائدہ، اعتقاد سے یہ ہے کہ اگر وہ ٹھیک ٹھیک ہوں تو تمام دنیا کی مذہب قومیں اخلاق کے بڑے بڑے اصولوں میں متفق ہوتی ہیں، گو کہ عقائد میں وہ کیسی ہی مختلف ہوں۔

(۵) کفر سے بھی بداخلاقی عمدہ بدتر ہے یا اس مطلب کو یوں کہو کہ اکثر لوگوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک نیک چلن نپٹ جاہل وحشی جس کو خدا کی باتوں کی کچھ خبر بھی نہیں پہنچی نجات پا سکتا ہے، مگر بدچلن معتقد آدمی نجات نہیں پا سکتا۔

(۶) اعتقاد کی خوبی اسی میں ہے کہ اس کا اثر اخلاق پر ہوتا ہے۔ اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ اعتقاد کی، یعنی خدا کے دیے ہوئے مذہب پر ایمان رکھنے کی خوبیاں کیا ہیں تو کیا ہم کو اس بات کی صحت جو ہم نے ابھی بیان کی خوبی معلوم ہوجاوے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کی خوبیاں ان باتوں میں ہیں جن کو میں بیان کرتا ہوں۔

۱۔ اخلاق کی باتوں کو سمجھنا اور ان کو اعلا درجے پر پہنچانا۔

۲۔ نیک اخلاق پر عمل کرنے کے لیے نئے نئے اور قوی اغراض کو بہم پہنچانا۔

۳۔ خدا کی نسبت عمدہ خیالات پیدا کرنا اور اپنے ہم جنسوں سے اچھا برتاؤ کرنا جس سے آپس میں محبت زیادہ ہو اور خود انسان اپنی سچی حالت کو، کیا بلحاظ اپنے نیچر کی خوبی کے اور کیا بلحاظ اس کی بدی کے بخوبی سمجھے۔

۴۔ برائی کی برائیوں کو ظاہر کرنا۔

۵۔ نجات کے لیے نیک اخلاق کو عام ذریعہ ٹھہرانا۔

مذہب کی خوبیوں کا یہ ایک مختصر بیان ہے، مگر جو لوگ اس قسم کے مباحثوں میں مشغول رہتے ہیں وہ نہاتے آسانی سے ان خیالوں کو ترقی دے سکتے ہیں اور مفید نتیجے ان سے نکال سکتے ہیں، مگر میں یقینا کہہ سکتا ہوں کہ ان سب باتوں کا ظاہر نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اخلاق میں کمال نہیں کرسکتا جب تک اخلاق کو عیسائی مذہب کا سہارا نہ ہو۔ یہ قول مسٹر ایڈیسن کا ہے، مگر میں یہ کہتا ہوں کہ کوئی اعتقاد کوئی مذہب سچا ہو ہی نہیں سکتا جب کا نتیجہ اخلاق کی عمدگی نہ ہو۔ پس اخلاق کو کسی

مذہب کا کچھ سہارا درکار نہیں ہے بلکہ مذہب یا اعتقاد کے سچ سمجھنے کو اخلاق کا سہارا درکار ہے۔

مسٹر ایڈیسن اور بھی دو ایک اصول قائم کرتے ہیں جو اس گفتگو سے علاقہ رکھتے ہیں:

(۱) وہ کہتے ہیں کہ ہم کو ایسی بات کو اعتقاد کی جڑ نہ قرار دینا چاہیے جس سے اخلاق کو استحکام اور ترقی نہ ہوئی ہو۔

(۲) کوئی اعتقاد صحیح بنیاد پر ہو ہی نہیں سکتا جس سے اخلاق خراب یا ان میں تنزل ہوتا ہو۔

یہ دونوں اصول مسٹر ایڈیسن کے ایسے عمدہ ہیں کہ دنیا میں کوئی شخص جس کے دل کی آنکھ خدا نے اندھی نہ کی ہو ان سے انکاری نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد مسٹر ایڈیسن انھیں اصولوں ہر ایک اور مسئلہ متفرع کرتے ہیں، وہ کہتے ہی کہ تمام مشتبہ مقاموں میں ہم کو نہایت غور کرنا چاہیے کہ اگر بالفرض وہ غلط ہو تو اس سے کیا کیا بد نتیجے پیدا ہوسکتے ہیں، مثلاً اپنے ایمان کے مضبوط کرنے اور خیالی ثواب حاصل کرنے کی امنگ میں لوگوں کو تکلیف دینا، لوگوں کے دلوں میں رنج اور نفرت، غصہ اور سخت عداوت پیدا کرنا اور جس چیز پر ان کو اعتقاد نہیں ہے زبردستی ان سے قبول کروانا۔ ایسے جذبات میں ہم اسی پر سب نہیں کرتے، بلکہ ان سب باتوں کے سوا ہم ان کو دنیا کے فائدے اور خوشی سے بھی محروم کرتے ہیں۔ اِن کے جسم کو تکلیف دیتے ہیں، ان کی دولت کو خراب کرتے ہیں، ان کی ناموریوں کو خاک ملاتے ہیں، ان کے خاندانوں کو برباد کرتے ہیں، ان کی زندگیوں کو تلخ کر ڈالتے ہیں، یہاں تک کہ آخر کار ان کو مار ڈالتے ہیں۔ پس جب کسی مسئلے سے ایسے بد نتیجے نکلیں تو مجھ کو اس مسئلے کے مشکوک ہونے میں کچھ شبہ نہیں رہتا۔ جیسے کہ علم حساب میں دو اور دو چار ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہوتا۔ پس ایسے مسئلے کو اپنے مذہب کی بنیاد نہیں ٹھہرا سکتا اور نہ اس پر عمل کرسکتا ہوں۔

اس قسم کے معاملات میں ہم صریح اپنے ہم جنسوں کو ضرر پہنچاتے ہیں اور جس مسئلے سے ہم ایسا کرتے ہیں بلاشبہ وہ مشکوک اور قابل اعتراض ہے، اخلاق اس سے بلکل خراب ہوجاتے ہیں۔

یہ مضمون مسٹر ایڈیسن کا غالباً عیسائی مذہب کے اس زمانے پر اشارہ ہے جب کہ رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ فرقے میں دشمنی کی آگ بھڑک رہی تھی اور مرد اور عورت و بچے مذہب نہ ماننے پر آگ میں جلائے جاتے تھے اور نہایت بد بخت خوں ریزیاں جو درحقیقت کرسٹانٹی کے بلکل خلاف تھیں ہو ہی تھیں۔

لوگ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے مذہب میں بھی ایسا ہی خوں خوار امن اور اخلاق کے برخلاف جہاد کا مسئلہ ہے۔ اگر وہ مسئلہ درحقیقت ایسا ہی ہو جیسا کہ بعض یا اکثر حقیقت تک نہ پہنچنے والے یا خودغرض لوگوں سمجھا ہے یا اکثر ظالم و مکار مسلمان حکمرانوں نے برتا ہے تو اس کے اخلاق کے برخلاف ہونے میں کون شبہ کرسکتا ہے مگر ہمارا اعتقاد یہ نہیں ہے، بلکہ جو حقیقت جہاد کی درحقیقت مذہب اسلام کی رو سے ہے وہ اخلاق کے برخلاف نہیں ہے۔ اس میں کسی قسم کا جبر یا

کسی کے مذہب کو جبر چھڑانا یا مذہب کے لیے کسی کا خون بہانا مطلق نہیں ہے۔ وہ صرف نیشنل لا پر یعنی اس قانون پر جو مختلف قوموں کو آپس میں برتنا چاہیے مبنی ہے اور جو آج کل مذہب سے مذہب قوموں میں جاری ہے۔

اس مسئلے کا ذکر ہم نے اپنی متعدد تصنیفات میں کیا ہے اور امید ہے کہ کبھی اس مضمون پر کوئی تحریر اس پرچے میں بھی چھاپیں گے۔

مسٹر ایڈیسن اپنے اس مضمون کو کسی مصنف کے نہایت عمدہ اور دل میں اتر کرنے والے کلام پر ختم کرتے ہیں اور وہ کلام یہ ہے :

''آپس میں نفرت پیدا کرنے کو تو ہمارے لیے مذہب کافی ہے، مگر ایک دوسرے میں محبت پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں۔''

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جو برتاؤ مذہبوں کا اس زمانے میں وہ ایسا ہی ہے اور مسلمانوں کا برتاؤ سب سے زیادہ برا ہے، مگر سچے مذہب کا، یعنی اسلام کا سچا مسئلہ یہ ہے کہ ''خدا کو ایک جاننا اور انسان کو اپنا بھائی سمجھنا، پس جو کوئی اس مسئلے کے برخلاف ہے وہ غلطی پر ہے۔

☆☆☆

ڈپٹی نذیر احمد

نصوح کی بیماری

اب سے دور ایک سال، دہلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا کے کوچے سے ہر ۳۰-۳۰، ۴۰-۴۰ ؍رچھپنے لگے۔ ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا۔ ورنہ جدھر جاؤ سنّاٹا اور ویرانی، جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی۔ جن بازاروں میں آدھی آدھی رات تک کھوئے سے کھوا چھلتا تھا ایسے اجڑے پڑے تھے کہ دن دو پہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف، سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا، اختلاط و ملاقات، آمد و شد، بیمار پرسی وعیادت، باز دید و زیارت، مہمان داری وضیافت کل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا، مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس۔ کہنے کو تو زندہ پر مردہ سے بدتر۔ دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں سکت، یا تو گھر میں اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑا رہا یا کسی بیمار کی تیمارداری کی یا کسی یار آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا۔

مرگِ مفاجات حقیقت میں انہیں دنوں کی موت تھی۔ نہ سان نہ گمان، اچھے خاصے چلتے پھرتے یکا یک طبیعت نے مالش کی پہلی ہی کلی میں حواس خمسہ مختل ہو گئے۔ الّا ماشاء اللہ کوئی جزئی بچ گیا تو بچ گیا۔ ورجہ جی کا متلانا اور قضائے مبرم کا آجانا۔ پھر وصیت کرنے تک کی مہلت نہ تھی۔ ایک پاؤ گھنٹے میں تو بیماری دوا دعا، جان کنی اور مرنا سب کچھ ہو چکتا تھا۔ غرض کچھ اس طرح کی عالم گیر وبا تھی کہ گھر گھر اس کا رونا پڑا تھا۔ دو پونے دو مہینے کے قریب وہ آفت شہر میں رہی مگر اتنے دنوں میں شہر کچھ ادھیا سا گیا۔ صد ہا عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ ہزاروں بچے یتیم بن گئے۔ جس سے پوچھے شکایت، جس سے سنو فریاد۔ مگر ایک نصوح جس کا قصہ ہم اس کتاب میں لکھنے والے ہیں کہ عالم شاہ کی تھا اور وہ اکیلا شکر گزار۔ دنیا فریادی تھی اور وہ تنہا مدّاح۔ نہ اس سبب سے کہ اس کو اس آفت سے گزند نہیں پہنچا۔ خود اس کے گھر میں بھی اکٹھے تین آدمی اس وبا میں تلف ہوئے۔ اچھی خاصی طرح گھر بھر رات کو سو کر اٹھا۔ نصوح نماز صبح کی نیت باندھ چکا تھا۔ باپ بیٹے وضو کر رہے تھے۔ مسواک کرتے کرتے ابکائی آئی۔ ابھی نصوح دوگانہ فرض ادا کر چکا تھا، سلام پھیر کر دیکھتا ہے کہ باپ نے قضا کی۔ ان کو مٹی دے کر آیا تو رشتے کی ایک خالہ تھیں ان کو جاں بحق تسلیم پایا۔ تیسرے دن گھر کی ماما رخصت ہوئی۔

مگر نصوح کی شکر گزاری کا کچھ اور ہی سبب تھا۔ اس کا مقولہ یہ تھا کہ ان دنوں لوگوں کی طبیعتیں بہت کچھ درستی پر آگء تھیں۔ دلوں میں رقت وانکساری کی وہ کیفیت تھی کہ عمر بھر کی ریاضت سے پیدا ہونی دشوار ہے۔ غفلت کو ایسا

تازیانہ لگا تھا کہ ہر شخص اپنے فرائض مذہبی ادا کرنے میں سرگرم تھا۔جن لوگوں نے رمضان میں بھی نماز نہیں پڑھی تھی وہ بھی پانچوں وقت سب سے پہلے مسجد میں آموجود ہوتے تھے۔جنہوں نے بھول کر بھی سجدہ نہیں کیا تھا ان کا اشراق وتہجد وتک قضا نہیں ہونے پاتا تھا۔دنیا کی بے ثباتی تعلقات زندگی کی ناپائیداری سب کے دل پر منقش تھی۔لوگوں کے سینے صلح کاری کے نور سے معمور تھے۔غرض ان دنوں کی زندگی اس پاکیزہ اور مقدا اور بے لوث زندگی کا نمونہ تھی جو مذہب تعلیم کرتا ہے۔

نصوح یوں ہی دل کا کچا تھا۔جب اس نے اوّل اوّل ہیضے کی گرم بازاری سنی، سرد ہو گیا اور رنگت زرد پڑ گئی۔ بہ اسباب ظاہری جو جو تدبیریں انسداد کی تھی سب کیں۔مکان میں نئی قلعی پھروادی۔ پاس پڑوس والوں کو صفائی کی تاکید کی۔گھر کے کونوں میں لوبان کی دھونی دی۔طاقوں میں کافور رکھوا دیا۔جابجا کوئلہ ڈلوایا۔ باروچی سے کہہ دیا کہ کھانے میں نمک ذرا تیز رہا کرے۔ پیاز اور سرکہ دونوں وقت دسترخوان پر آیا کرے۔گلاب، نارجیل دریائی بادیان، تمر ہندی، سکنج بین وغیرہ جو جو دوائیں یونانی طبیب اس مرض میں استعمال کرتے ہیں، تھوڑی تھوڑی سب بہم پہنچا لیں تاکہ خدانخواستہ ضرورت کے وقت کوئی چیز ڈھونڈنی نہ پڑے۔نصوح نے یہاں تک اہتمام کیا کہ انگریزی دوائیں بھی فراہم کیں۔کالرا کی گولیاں تو وہیں کوتوالی سے لیں۔کالرا ٹنکچر الہ آباد میڈیکل ہال سے روپیا بھیج کر منگوا رکھا۔آگرے سے ایک دوست کی معرفت کلوروڈائن کی دو شیشیاں خرید لیں۔ایک اخبار میں لکھا دیکھا کہ بنارس میں ایک بنگالی اس بیماری کا حکیمی علاج کرتا ہے اور سرکار سے جو دس ہزار روپے کا انعام موجود ہے اس کا دعوے دار ہوا ہے۔چٹھی لکھ کر اس کی دوا بھی طلب کی۔نصوح کو ایک وجہ تسلی یہ بھی تھی کہ ایک طبیب حاذق اسی کے ہمسایہ میں رہتا تھا گو روسیاہ، ہیضے کے توڑنے کے واسطے اتنا سامان وافر موجود تھا مگر آخر نصوح کا گھر بھی فرشتوں کی نظر سے نہ بچا۔ باپ کی اجل آئی تو دوائیں رکھی ہی رہیں۔دینے اور پلانے کی نوبت بھی نہ پہنچی کہ بڑے میاں سسکیاں لینے لگے۔وہ رشتے کی خالہ کچھ تھوڑی دیر سنبھلی تھیں لیکن وہ کچھ ایسی زندگی سے سیر تھیں کہ انہوں نے خود خبر کرنے میں دیر کی۔غرض دوا ان کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ ماما نے البتہ انگریزی یونانی سب طرح کی دوائیں ڈھکوسیں مگر اس کی عمر ہو چکی تھی۔اول اول نصوح کو اپنی احتیاط پر کچھ یوں ہی سا تکیہ ہوا تھا مگر جب وبا کا بہت زور ہوا اور خود اسی کے گھر میں تابڑتوڑ ایک چھوڑ تین تین موتیں ہو گئیں تو ناچار تن بہ تقدیر صبر و شکر کر کے بیٹھ رہا۔

غرض پورا ایک چلّہ شہر پر سختی ومصیبت کا گزرا۔نہیں معلوم کتنے گھر غارت ہوئے۔کس قدر خاندان تباہی میں آ گئے۔ یہاں تک کہ نواب عمدۃ الملک نے ہیضہ کیا۔کوئی دو تین گھڑی دن چڑھتے چڑھتے شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی اور نماز جمعہ کے بعد دیکھتے ہیں تو جنازہ جامع مسجد کے صحن میں رکھا ہے۔ یوں تو ہزارہا آدمی شہر میں تلف ہوئے مگر عمدۃ الملک کی

موت سب پر بھاری تھی۔اول تو ان کی ٹکر کا شہر میں کوئی رئیس نہ تھا۔دوسرے ان کی ذات سے غریبوں کو بہت کچھ فائدہ پہنچتا تھا۔گو ان کے مرنے کا گھر گھر میں ماتم تھا۔لیکن لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ بس اب خدا نے ٹھنڈک ڈالی کیونکہ معتقدات عوام میں یہ بھی ہے کہ وبا بے کسی بڑے رئیس کی بھینٹ لئے نہیں جاتی۔خیر لوگوں نے جو کچھ سمجھا ہو یوں بھی شورش بہت کچھ فرد ہو چکی تھی اور امن ہوتا جاتا تھا۔لوگوں نے دکانیں بھی کھولنی شروع کر دیں اور دنیا کا کاروبار پھر جاری ہو چلا تھا۔

انہیں دنوں نصوح نے اپنی بیوی سے کہا کہ دو مہینے سے چاولوں کو ترس گئے۔اب خدا نے فضل کیا، آج زردہ پکواؤ، مگر تاکید کرنا کہ چاول کھڑے نہ رہیں۔شام کو زردہ پکا اور گھر کے چھوٹے بڑے سب نے کھایا اور حسب عادت سو رہے۔کوئی پہر رات باقی رہی ہوگی کہ دفعتاً نصوح کی آنکھ کھل گئی۔جاگا تو پیٹ میں آگ پھُنکی ہوئی تھی۔اٹھتے اٹھتے کئی مرتبہ طبیعت نے مالش کی۔اس نے ننگے سر جلدی سے صحن میں نکل کر ٹہلنا شروع کیا۔خوب کر دونوں بازو باندھے، گلے میں توے کی سیاہی تھوپی، عطر کا پھویا ناک میں رکھا اور طبیعت کو دوسری طرف مصروف کیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ حلق تک کوئی چیز بھری ہوئی ہے۔بہتیرا ضبط کیا، بہتیرا ٹالا، آخر بڑے زور سے استفراغ ہوا۔گھر والے سب جاگ اٹھے۔نصوح کو اس حالت میں باہر بیٹھا ہوا دیکھ کر سب کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔کوئی پانی اور بیسن لے کر دوڑا، کوئی الائچی ڈال پان بنا کر پاس کھڑا ہوا، کوئی پنکھا جھلنے لگا۔نصوح کو تولا کر چارپائی پر لٹایا اور سب لوگ لگے اپنی اپنی تجویزیں کرنے۔کسی کے کہا خیریت ہے، غذا تھی۔کوئی بولا زردے میں گھی بُرا تھا۔کوئی کہنے لگا گھر چن کا فساد ہے۔غرض یہ صلاح ہوئی کہ ہیضہ وبائی نہیں ہے۔گلاب اور سونف کا عرق دیا جائے اور گھبرانے کی بات نہیں، صبح تک طبیعت صاف ہو جائے گی۔

خیر یہ تو تیمارداروں کا حال تھا۔نصوح اگر چہ تکان کی وجہ سے مضمحل ہو گیا تھا مگر ہوش وحواس سب خدا کے فضل سے بجا تھا۔سب کی صلاحیتیں اور تجویزیں سنتا تھا اور دوا جو لوگ پلاتے تھے پی لیتا تھا۔لیکن استفراغ ہونے کے ساتھ ہی اس نے کہہ دیا تھا کہ لو صاحب خدا حافظ، ہم بھی رخصت ہوتے ہیں۔استفراغ اِمتلائی مجھ کو بارہا ہوئے ہیں۔مگر اس وقت میرا جی اندر سے بیٹھا جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں میں سنسنی چلی آتی ہے۔اتنا کہنے کے بعد تو نصوح دوسری ہی اُدھیڑ بن میں لگ گیا اور سمجھا کہ بس دنیا سے چلا۔

صبح ہوتے ہوتے روات کے کل آثار پیدا ہو گئے۔برد اطراف تشنج، ضعف، متلی، اسہال، تشنگی، ہر ایک کیفیت اشتداد پر تھی۔منہ اندھیرے آدمی حکیم کے پاس دوڑا گیا۔حکیم صاحب خود خفقانی مزاج ہیضے کے نام سے کوسوں بھاگتے تھے۔مگر ہمسائیگی، مدت کی راہ ورسم، طوعاً کرہاً آئے اور کھڑے کھڑے چھڈ اما اتار کر چلے گئے۔بیمار میں تو بولنے اور بات کرنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ایک پہر ہی کی بیماری میں چارپائی سے لگ گیا تھا۔عورتوں نے پردے میں سے جہاں

تک اُس گھبراہٹ میں زبان نے یاری دی کہا، حکیم صاحب یہی کہے چلے گئے کہ برف کے پانی میں نارجیل دریائی گھس گھس کر پلائے جاؤ۔

تیمارداروں کو ایسی سرسری تشخیص اور ایسی رواروی کی تجویز سے کیا خاک تسلی ہوتی۔ فوراً آدمی کو شفاخانے دوڑایا اور ڈاکٹر دوا لے صدا کی طرح آموجود ہوا۔ اوپر تلے چار پڑیاں تو اس نے اپنے سامنے پلائی۔ چلتے ہوئے ایک عرق دیتا گیا کہ پاؤ گھنٹے بعد پلاکر مریض کو علاحدہ مکان میں اکیلا لٹادینا، کوئی آدمی اس کے پاس نہ رہے تاکہ اس کو نیند آجائے۔ اگر سوگیا تو جاننا بچ گیا۔ فوراً ہم کو خبر دینا۔

ڈاکٹر کے حکم کے مطابق نصوح کو اکیلے دالان میں سُلا کر لوگ اِدھر اُدھر ٹل گئے۔ مگر دبے پاؤں آکر دیکھ دیکھ جاتے تھے۔ نصوح کے دل کی جو کیفیت تھی وہ البتہ عبرت انگیز تھی۔ یہ کچھ تو بیماری کا اشتداد تھا مگر ہوش وحواس سب بدستور تھے۔ وہ اپنے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ جانتے تھے غش میں پڑا ہے۔ ابتدا میں نصوح بھی اپنی نسبت مرنے کا تصور کرنے سے گریز کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اپنے تئیں مرنے والا سمجھنے، بلکہ جو لوگ اس کی علالت کو سوءِ ہضم اور امتلا کی وجہ سے تجویز کرتے تھے۔ دل میں ان کی رائے کی تحسین کرتا تھا۔ لیکن افسوس یہ مسرت نصوح کو بہت ہی ذرا سی دیر تک نصیب ہوئی۔ دم بہ دم اس کی حالت ایسی ردّی ہوتی جاتی تھی کہ زندگی کے تمام تر احتمالات ضعیف ہوگئے۔ آخر چاروناچار اُس کو سمجھنا پڑا کہ اب دنیا میں چند ساعت کا مہمان اور ہوں۔ اذعانِ مرگ کے ساتھ پہلے قلق اس کو دنیا کی مفارقت کا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ مرنا وہ سفر ہے جس انقطاع نہیں، وہ جدائی ہے کہ جس کے بعد وصال نہیں، وہ گمشدگی ہے جس کی کبھی بازیافت نہیں، وہ غشی ہے جس سے افاقہ نہیں، وہ بیگانگی ہے جس کے پیچھے کوئی تعلق نہیں۔ کبھی وہ بیوی بچوں کو دیکھ کر روتا اور کبھی وہ ساز وسامانِ دنیا پر نظر کرکے سر دھُنتا اور کہتا ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم بہار آخر شد

جس جس پہلو سے غور کرتا تھا اپنا مرنا اس کو بے وقت معلوم ہوتا تھا۔ بیوی کو دیکھ دیکھ کر اپنے جی میں سوچتا تھا کہ بھلا کوئی اس کی عمر بیوہ ہونے کی ہے۔ نہ تو اس کے میکے میں کوئی اتنا ہے کہ اس کا متکفل ہو۔ نہ بیٹوں میں کوئی اس قابل ہے کہ گھر کو سنبھال لے۔ اندوختہ جو ہے سو واجبی ہی واجبی ہے کب تک اکتفا کرتے گا۔ وہ ناکتخدا بیٹیاں اس کے آگے ہیں۔ کچا ساتھ خالی ہاتھ، بچوں کی پرورش کہیں سے کوڑی کی آمد کا آسرا نہیں، کیا ہوگا اور کیونکر یہ پہاڑ سی زندگی اس سے کاٹے کٹے گی۔ بڑا لڑکا تو پہلے ہی گویا ہاتھ سے جاچکا ہے۔ رہا منجھلا، امسال انٹرنس پاس کرنے کو تھا اور امید تھی کہ یہ کچھ ہوگا اب وہ تمام منصوبہ ہی غلط ہوا چاہتا ہے۔ میری آنکھ بند ہوئی تو کیسا پڑھنا اور کس کا امتحان۔ یہ دو لڑکیوں کا فرض کیسا

میں اپنی گردن پر لے چلا۔ بڑی لڑکی کی نسبت کن کن مصیبتوں سے ٹھہری تھی۔ اور جب میرے رہتے یہ دقت تھی تو ان دو بچیوں کا دیکھئے کیا ہو۔ پیش بینی اور مآل اندیشی کر کے پارسال گانو لیا تھا۔ ابھی تک پٹی داروں نے اس میں اچھی طرح تسلط بیٹھنے نہیں دیا۔ اب جو چالیس پچاس بیگھ سر کر کے نیل بولیا تھا وہ سب گیا گزرا ہوا۔ گودا پر جو روپیا لگا دیا تھا وہ بھی ڈوبا۔ رہنے کے مکان میں کسی تنگی سے بسر ہوتی ہے۔ کوئی مہمان آ نکلتا ہے تو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شمال میں یہ دالان دردالان بنوانے کا ارادہ تھا۔ دہرہ دون لکڑی کا روپیا بھیج چکا ہوں وہ نہیں آئی۔ پزاوے والوں کو اینٹوں کی دادنی دی تھی وہ نہیں پٹی۔ افسوس کہ موت نے مجھ کو مہلت نہ دی۔ لوگوں کا لینا دینا حساب کتاب، بڑے بڑی بکھیڑے ہیں۔ آج سمجھانے بیٹھوں تو مہینوں میں جا کر طے ہوں تو ہوں۔ اجل سر پر آ پہنچی۔ تمام لینا لوانا مارا پڑا۔ اے کاش میں کچھ نہیں تو دس بارہ برس ہی اور جی جاتا تو یہ سب انتظام اپنی خواہش کے مطابق درست کر لیتا۔ بال بچے بھی ذرا اور سیانے ہو جاتے کھانے کمانے لگتے۔ ادھر ان کی شادی بیاہ کر چکتا۔ گانو کا معاملہ بھی کچھ ذخیرۂ وافر فراہم کر جاتا، تب فراغت سے مرتا۔ مرنے میں مجھ کو کچھ عذر یا خدانخواستہ کسی طرح کا انکار تھا۔ میں اتنا ذرا سی بات نہیں سمجھتا کہ دنیا میں آ کر مرنا ضرور ہے۔ مگر ہر چیز ایک وقت مناسب پر ٹھیک ہوتی ہے۔ یہ بھی کوئی مرنا ہے کہ ہر ایک کام کو ادھورا اور ہر ایک انتظام کو ناقص و ناتمام چھوڑ کر چلا جاؤں۔ ایسا بے ہنگام مرنا نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے تمام متعلقین اور وابستگان کے لئے موجب زیاں باعث نقصان ہے۔

اگر چہ نصوح بہ نظر ظاہر ایک آزاد اور بیگانہ وار زندگی بسر کرتا تھا۔ نہ تو ہر وقت گھر میں گھسے رہنے کی اس کی خو تھی، نہ بال بچوں ہی سے بہت کچھ اختلاط کرنے کی عادت، انتظام خانہ داری میں بھی بی بی کے تقاضے اور اصرار سے بہ قدر ضرورت کچھ دخل دیا تو دیا ورنہ اس کی بھی چنداں پروانہ تھی اور یہ سبب تھا کہ جب کبھی سننے کا اتفاق ہوتا کہ فلاح شخص نے بڑی حسرت کے ساتھ جان دی تو نصوح کو تعجب ہوتا اور کہتا کہ خدا کی شان ہے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ دنیا سے نکلنے کو ان کا جی نہیں چاہتا۔ نہیں معلوم دنیا کی کون سے ادا اُن کو پسند ہوتی ہے۔ ورنہ استغفر اللہ یہ دارالمحن انسان کے رہنے کے لائق ہے۔ صدہا بکھیڑے، ہزارہا مخمصے، روز کے جھگڑے، آئے دن کی مصیبت، سچ ہے خدائے تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت اور بندوں کی مصلحت سے خالی نہیں۔ ظاہر میں تو موت سب کو بُری معلوم ہوتی ہے اور اس سے لوگ ایسے ڈرتے ہیں جیسے مجرم سزا سے۔ لیکن غور کر کے دیکھو تو مرنا بھی ایک نعمت ہے۔ انسان کی طبیعت تازگی پسند واقع ہوئی ہے۔ جہاں ایک حالت سالہا سال رہی گو وہ حالت کیسی ہی عمدہ اور پسندیدہ کیوں نہ ہو خواہ مخواہ آدمی اس سے ملول ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہی من وسلویٰ کھاتے کھاتے ایسے اکتائے کہ آخر کو ان کے دل لہسن اور پیاز پر للچائے۔ اگر دنیا میں موت نہ ہوتی تو آدمی کنوؤں میں کود کود کر اور درختوں سے گر گر کر جان دیتے اور حیات دراز کو عذاب مقیم سمجھتے۔ میرے

دل کی تو یہ کیفیت ہے کہ مجھ کو یہاں جانے کی مطلق پروانہیں۔اور کسی چیز کو میں نہیں سمجھتا کہ مجھ کو اس کی مفارقت کا قلق ہو۔

لیکن بڑا فرق ہے فرض اور واقعات میں۔یہ بھی نصوح کے نفس کا مکر تھا کہ وہ اپنے تئیں دنیا سے بے تعلق اور اپنی زندگی کو بے ہمہ و باہمہ سمجھتا تھا۔جب تک دوسروں کو مرتا دیکھتا تھا اپنے تئیں مرنے پر دلیر پاتا تھا لیکن جب خود اپنے سر آن بنی تو سب سے زیادہ بودا نکلا۔وہ اپنے تعلقات سے واقعی میں اب تک بے خبر تھا۔جب موت سامنے آموجود ہوئی اور چلنا ٹھہر گیا تو حقیقت کھلی کہ ادھر زن و فرزند کا فریفتہ ہے،اُدھر مال و متاع کا دل دادہ۔اتنا بڑا تو سفر اس کو درپیش مگر بار علائق کی وجہ سے پہلے ہی قدم پر اس کے پانو ہزار ہزار من کے ہو رہے تھے۔ریل کی سیٹی بج چکی تھی۔مگر یہ ابھی اسٹیشن کے باہر اسباب کے سنبھالنے میں مصروف تھا۔

اگر اسی حالت میں کہ اس کی روح تعلقات دنیوں میں ڈانواڈول بھٹکتی ہوئی پھر رہی تھی کہیں خدانخواستہ اس کی جان نکل جاتی تو بس دونوں جہاں سے گزرا ہوا تھا۔خَسِرَ الدُّنیَا وَ الْاٰخِرَۃِ از ایں سو راندہ وز اں سو در ماندہ۔مگر خدا جانے بڑا فضل کیا کہ نا امیدی نے اس کی ہمت بندھائی اور اپنے دل میں سوچا کہ چلنا تو اب ٹلتا نہیں،پھر قلق سے فائدہ اور اضطراب سے حاصل۔مرتا ہوں تو مردانہ وار کیوں نہ مروں اور استقلال کے ساتھ جان کیوں نہ دوں۔اس بات کا ذہن میں آنا تھا کہ دنیا کی تمام چیزوں پر ایک اداسی چھا گئی۔اب جس چیز کو دیکھتا ہے ہیچ اور بے وقعت نظر آتی ہے۔یہ وہ وقت تھا کہ ڈاکٹر نے اس کو دوا پلوا کر تنہا لٹوا دیا تھا۔استغنا سے ایک اطمینان جو دل کو پہنچا اور ادھر علالت کے اشتداد کا تکان تھا ہی اوپر سے پہنچی دوا جو بالخاصہ خواب آور تھی اور تیمارداروں کا ہجوام کم ہوا۔لیٹا تو نیند کی ایک جھپکی سی آ گئی۔

☆☆☆

مولوی عبدالحق

نام دیو مالی

نام دیو مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی نیکی حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں ؎

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سے کھڑکی تھی۔اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک بودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھتا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے، پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا پھلتا تھا۔ ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر

منگا تا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کے ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا۔ اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھتے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لئے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لاکر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لئے بلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر جھاڑنا بہارنا صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسرے سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے تھے۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ یا بیڑی پینے لگے۔ یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے۔ جیسے دِق کی بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ اور وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انہیں پینے کو پانی مشکل سے میسر تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا۔ اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھوڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا یوں سمجھئے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کو پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج

الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغبانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ درانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب وتعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے۔ مدت سے ویرانی اور سنسان پڑا تھا۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور سیر وتفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے۔ اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، تہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اوپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فن باغبانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا۔ اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اس کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے، جھگڑتے، سندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا، جھگڑتا نہ سندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ اسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسر المز اج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا لیکن اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لئے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا۔ لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں

قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔درجۂ کمال تک نہ بھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔حسان کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔وہ کسی عبادت کا محتاج نہیں۔وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

☆☆☆

رشید احمد صدیقی

الیکشن

جس زمانے کا میں تذکرہ کررہا ہوں، اس میں قانونی عدالتیں کچھ یوں ہی سی ہوا کرتی تھیں اور حاکمِ عدالت بھی باضابطہ یا قانون دانی کے اعتبار سے کچھ نیاز مند ہی ہوتے تھے۔ وکیل مختار بھی ایسے نہیں ہوتے تھے جیسے آج کل ہیں۔ آج کل کے قانون یا قانون دانوں کے کمالات دیکھ کر تو اکثر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ افسوس تمام عمر یوں ہی گزار دی، کیوں نہ کوئی سنگین جرم کیا۔ شہرت بھی ہوتی اور بَری بھی ہو جاتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاً یہ خطرہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ''رب کا شکر ادا کر بھائی'' بغیر کسی جرم کے بھی تو سزا پا جاتے ہیں۔ اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ ان سے دور ہی رہا جائے۔ یہی حال ڈاکٹروں کا ہے۔ ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ مرض سمجھ میں نہ آئے تو کوئی ایسا مرض پیدا کر دینا چاہئیے جو سمجھ میں آتا ہو۔ اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ مرض کچھ ہی کیوں نہ ہو، علاج کسی دوسرے مرض کا شروع کر دینا چاہیے۔ اس طور پر تیسرا مرج یقینا پیدا ہو جائے گا اور پھر اس کو قابو میں لانے کی کوشش کر لی جایا کرے گی۔ قابو میں آ گیا تو خیر ورنہ جہاں تک مرض کا تعلق ہے پوسٹ مارٹم کے نتائج تو آسانی سے متعین ہو جائیں گے۔

ہاں تو میں تذکرہ کر رہا تھا، اگلے زمانے کے حاکموں اور قانون دانوں کا۔ چنانچہ جن بزرگ یعنی حاکم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ آپ کی دعا سے ضابطہ یا قانون سے کچھ زیادہ واقف نہ تھے اور وکیلوں اور مختاروں سے اتنے ہی خائف یا مشتبہ رہتے تھے جتنا خود ملزم حاکمِ عدالت اور وکیل مختار دونوں سے۔ حاکم نے سوچتے سوچتے یہ ترکیب نکالی کہ وکیل مختار سے گلوخلاصی حاصل کر لی جائے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ قانون کی گہری گہری ٹھوس باتوں سے دماغ یکسو نہیں رہنے پاتا، اس لیے نفس معاملے پر صحیح کچھ غلط بھی نہیں ہے، یعنی اس کے غلط ہونے کا بھی امکان ہے۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ یہ بات ذرا گہری ہے اور ممکن ہے میں اسے واضح نہ کر سکوں۔ لیکن اس سے یہ تو نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ آپ بھی کچھ نہ سمجھ سکے ہوں یا حاکم کی نیت بخیر نہ ہو۔

چنانچہ حاکم نے وکیل مختاروں سے کہا: ''حضرات! آپ لوگ قانون کی ایسی بال کی کھال نکالتے ہیں کہ نفس معاملہ گاؤ خورد ہو جاتا ہے اور انصاف کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس لیے آپ لوگ خاموش رہا کیجیے۔ میں چاہتا ہوں کہ فریقین خود ایک دوسرے سے بحث کریں۔ یہ خود بحث کریں گے تو حق کا فرشتہ یا ناحق کا شیطان فریقین متعلقہ کے سر اور چہرے

کے اردگرد دحمد گا تا ہوا، رقص کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اس وطر پر عدالت کو صحیح فیصلہ صادر کرنے میں سہولت ہوگی۔'' وکلا نے کچھ کہنا چاہا تو گرگ باراں دیدہ پیشکار نے اپنی شیشہ کی میلی عینک ناک کے پھننگ پر رکھ کر کہا: ''صاحبو! اس معاملے میں آپ لوگ خاموش ہی نہیں بلکہ عدالت کے کٹہرے سے ذرا دور ہٹ جایا کریں تو زیادہ بہتر ہوگا ورنہ جس وقت عدالت میں انصاف کے فرشتے یا ظالم یا مظلوم کون ہے۔ عدالت، فریقین یا وکلا؟ یہ تو کہیے کہ حاکم کے سر پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ غیبی مہمانوں کا عدالت کے کمرے میں نازل ہونا کوئی معمولی بات ہے؟''

غرض حاکم کا حکم بحال رہا۔ فریقین خود اپنے حقوق ایک دوسرے پر جتانے اور عدالت بجائے خود کسی نتیجے پر پہنچتی اور اسی کے مطابق فیصلہ کرتی۔ کچھ دنوں یہی لیل و نہار رہے، حق کے فرشتے اور ناحق کے شطان آتے رہے۔ حاکم کے سر پر خدا کا سایہ بھی قائم رہا۔ البتہ پیشکار پر وکیل مختاروں کا سایہ ذرا ضرورت سے زیادہ گہرا پڑنے لگا۔

ایک دن عدالت نوشیروانی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ فریقین پیش ہوئے۔ لب و لہجے میں حرارت پیدا ہوئی۔ حرارت سے چنگاری برآمد ہوئی۔ چنگاری نے شعلے کا رنگ پکڑا، یہاں تک کہ ایک دھماکہ ہوا اور ناحق کے شیطان نے حق کے فرشتے کو دبوچا۔ سر سے بلند کیا اور زمین پر دے مارا۔

فلک گفت احسن ملک گفت واہ

عدالت نے فوراً فیصلہ صادر کیا یعنی شیطان حق پر تھا اور فرشتہ ناحق پر۔

حاکم نے آرام کرنے کا راستہ لی۔ پیشکار اور وکلا طلب ہوئے۔ فیصلے کی داد چاہی گئی۔ حاضرین نے تخلیہ میں نہایت ادب سے دریافت کیا کہ یہ غیبی فیصلہ کیونکر صادر کیا جاتا تھا اور اس رمزے سے دنیا آگاہ ہو جائے تو ناحق و ناحق کے جھگڑے بڑی آسانی سے طے ہو جایا کریں۔ حاکم صاحب پہلے سوچ میں پڑ گئے، پھر ڈھیلے پڑے اور ہرچہ بادا باد کا سا انداز اختیار کر کے مسکرا پڑے اور پھر بولے: ''تم کو اتنی سی بات نہیں معلوم کہ حق کی آواز کوئی دبا نہیں سکتا۔ میں فریقین کی بحث کو اتے غور سے نہیں سنتا جتنا ان کے لب و لہجے اور تیور اور بحث کے انجام پر نظر رکھتا ہوں۔ چنانچہ جس کو یہ دیکھتا ہوں کہ چیخ و پکار، گالی گلوج، مار دھاڑ کے اعتبار سے چرب پڑ رہا ہے، اسی کے موافق فیصلہ دے دیتا ہوں، اس لیے کہ حق کی آواز کبھی دبائی نہیں جا سکتی۔'' اس راز کا انکشاف ہونا تھا کہ حاضرین پہلے تو دم بخود ہوئے پھر کسی نے حاکم کی طرف دیکھ کر سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے نعرے لگائے اور کسی نے پیشکار سے مخاطب ہو کر دھن ہے مہاراج کی جے کار لگائی۔ حاکم کے ہاتھ چومے، پیشکار کے پانو چومے اور کانوں پر ہاتھ اور سر پر پانو رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

انصاف کرنے کا یہ طریقہ ایک راز تھا جو صرف حاکم صاحب پر منکشف ہوا تھا۔ تھوڑا بہت پیشکار پر بھی۔ چنانچہ جس حادثے یا فیصلے کا تذکرہ ابھی ابھی کیا گیا ہے، یہ پیشکار ہی کی مخبری کا نتیجہ تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ منہ سے نکلی ہوئی

پرائی بات، انصاف کا یہ طریقہ کچھ پینٹ تو کرایا نہیں گیا تھا۔ پھر موجودہ دورے کے ذرائع و وسائل آمدورفت جیسے بے پناہ ہیں وہ بھی ظاہر ہے۔ انجام یہ ہوا کہ یہ چیز ساری دنیا میں پھیل گئی ہے اور اسی اصول پر دنیا میں انصاف کا کاروبار ہو رہا ہے جس میں خدا رکھے الیکشن بھی شامل ہے۔

یہی حالت ہماری زندگی کے تمام نشیب وفراز میں پائی جاتی ہے۔ اسی کو 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کہتے ہیں۔ اس کا نام مسابقت رکھا گیا ہے۔ اسی کو تہذیب کا علم یا تمدن کی فتح کہتے ہیں اور خدا جانے اور کیا کیا کہتے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع تو تھا مگر بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے خود یاد نہیں آتے ورنہ یقین مانیے کہ کسی نہ کسی طور پر ضرور سنا دیتا۔

ہاں تو بات نکل آتی ہے، یعنی آج کی صحبت میں ریڈیو والے اس امر کے درپے ہیں کہ الکشن کے بارے میں میری آپ کی گلخپ ہو جائے اور آپ کو معلوم ہو جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں برسات کے موسم میں بالعموم لوگ کشتی لڑتے ہیں، جھولا جھولتے ہیں اور پھلواریاں کھاتے ہین، سیلاب آیا تو درخت گئے، ہیضہ ہوا تو اسی درخت کے بھوت یا دینت بن گئے۔ لیکن یہ بات تو عوام یا جہلا سے متعلق ہے۔ مذہب لوگ ایسا نہیں کرتے، وہ کشتی کے بجائے الکشن لڑتے ہیں۔ کونسلوں میں پینگیں بڑھاتے ہیں اور کمیٹیوں میں پکوان اڑاتے ہیں۔ سیلاب آئے، سوکھا پڑے یہ اپنے حلقۂ انتخاب میں مقیمان پڑھتے رہتے ہیں۔

مرغ شاخِ درخت لا ہوتیم

مرغ اور شاخ پر مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یہ واقعہ اکثر بے موقع ہی یاد آتا ہے اور یہاں مجھے غیر متعلق سا بھی معلوم ہوتا ہے لیکن آپ معاف فرمایئے اگر میں اسے یہاں بیان کردوں، آپ کا نقصان نہ ہوگا اور میرا خلجان دور ہو جائے گا، یعنی یہ واقعہ یاد آنا بھول جائے گا۔ وہ واقعہ میں سنائے دیتا ہوں، موقع آپ تلاش کر لیجیے گا، کیوں کہ ہم آپ پڑھتے آئے ہیں گو برتنے کا کبھی موقع نہ ملا کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔

ایک دن یہی الیکشن کی فصل تھی، ووٹ لینے کے لیے موٹر، ڈنڈے اور لڈو لیے ہوئے میری تلاش میں نکلے تھے۔ تین امیدوار تھے اور میں نے تینوں سے ووٹ دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ ایسے تو اس بنا پر مجھ پر اس روپے واجب تھے، دوسرے سے یوں کہ میں اس کا کاشتکار تھا اور تیسرے سے اس لیے کہ یہ شخص بات کرتے کرتے یا تو کبھی خود رو پڑتا تھا یا مجھے مار ڈالنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔

ظاہر ہے ایسی حالت میں میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کہیں بھاگ جاؤں۔ لیکن آپ نے سنا ہوگا کہ گیڈر کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ میں اتفاق سے ایک ایسے مقام پر جا نکلا جہاں ہر طرف عجیب وغریب قسم کے لوگوں کا ہجوم تھا، کہیں گراموفون بج رہا تھا، کہیں کھانے پکانے اور کھلانے کا انتظام تھا۔ ایک طرف سپیرا سانپ

کے اور دوسری طرف مداری بندر بھالو اور بکری کے کرتب دکھا رہا تھا۔ ایک طرف سبیل لگی ہوئی تھی، دوسری طرف ناچ رنگ کا سامان تھا۔ ایک جگہ کچھ لوگ لکچر دے رہے تھے۔ لکچرار اور حاضرین کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ شاید کوئی منچلا کسی سنیاسی یا فقیر کی بنائی ہوئی جڑی بوٹیوں کے خواص بتا رہا تھا۔ ابھی میں اسی حیص وبیص میں تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے کہ ایک صاحب نے نہایت دوستانہ انداز میں پیچھے سے آ کر میری گردن پکڑی اور آگے پیچھے کھینچ ڈھکیل کر جیسے رائفل میں کارتوس بھرے جاتے ہیں، بولے: ''کیوں آپ کا نام بندو خاں ہے۔ چلیے ووٹ دیجیے اور یہ بیڑی پیجیے، بڑا انتظار دکھایا۔'' میں نے دوستی کا اعتراف ابھی اسی حد تک کیا تھا کہ بیڑی لینے پر آمادہ ہوا تھا کہ ایک دوسرے صاحب نے مجھے اپنی طرف گھسیٹا اور بولے: ''خبردار، بدھو خلیفہ میرے ووٹر ہیں۔ لڑکپن میں ہم دونوں کپاس چرایا اور مار کھایا کرتے تھے۔ کیوں خلیفہ بھولے تو نہیں۔ ابھی میں نے پورے طور پر حافظے کا امتحان نہیں لیا تھا نہ دیا تھا کہ ایک تیسرے بزرگ آگے بڑھے اور میرا گریبان کھینچ کر بولے: ''واہ میرے بنّی! تم نے تو کنویں جھکوا دیے، ایسا بھی کیا غائب ہونا، چلو کچھ کھا پی لو، اس کے بعد مجرا سنیں گے۔'' لیکن اس سارے قضیے کا انجام یہ ہوا کہ مجھے اس کمرے میں لے گئے جہاں ووٹروں کی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ اصلی شخص جس کا ووٹ پڑنے والا تھا بندہ حسن تھا۔ کلرک نے پوچھا: ''حسن کون ہے؟'' میرے ایک دوست نے مجھے آگے بڑھا کر کہا: ''صاحب! ان کا اصلی نام بندہ حسن ہے لیکن یہ نام ماں باپ نے رکھا تھا ورنہ عام طور پر ان کو بندو خان کہتے ہیں۔'' دوسرے نے کہا: ''ارے بھائی! اللہ سے ڈرو، بدھو خلیفہ ہیں، اسی نام سے ووٹ دیں گے۔'' تیسرے نے لپک کر للکارا: ''ارے لوگو، خدا سے ڈرو یا نہ ڈرو، حوالات سے تو ڈرو، میرے بنّی کو بدھو خلیفہ کہتے شرم نہیں آتی۔'' کلرک گھبرا کر مجھ سے پوچھا: ''آخر تم کیسے چپ ہو۔ تم ہی بتاؤ تمھارا نام کیا ہے؟''

میں نے کہا: ''حضور اپنا اصلی نام مجھے بھی ٹھیک نہیں معلوم، لیکن کشتی لڑتا تھا تو اکھاڑے میں بندو خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ غازی میاں کا علم اٹھانے لگا تو بدھو خلیفہ کہلایا۔ اب نفیری اور فیرینی بیچتا ہوں تو لوگ میر بنّی کہنے لگے۔'' کلکر بھی زندہ دل تھا بولا: ''تم نے آنے میں جلدی کی ورنہ یہ لوگ تم کو اس مبر کی حیثیت سے پیش کر دیتے جس کے تم ووٹر سمجھے جاتے ہو، لیکن اب یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ۔ ورنہ تمھاری خیر نہیں۔''

میں بھاگا اور سارا مجمع میرے پیچھے ہولیا۔ ایک ہلڑ مچ گیا اور مشہور یہ ہوا کہ میں بچوں کو چُرا لے جایا کرتا ہوں۔ قریب تھا کہ مجمع کے ہاتھوں صبر وشکر قسم کی کوئی چیز بن جاتا کہ میں ایک گلی میں ہولیا اور شور مچایا کہ پولنگ اسٹیشن پر بلوہ ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجمع پولنگ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا اور میں بھاگا، گرتا پڑتا، سامنے ایک عالی شان عمارت تھی اس میں داخل ہوا اور بے ہوش ہوگیا۔ یہ جانوروں کا عجائب خانہ تھا۔ دوسرے دن آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اسپتال میں پایا۔ قریب ہی ایک اخبار رکھا تھا جس میں نہایت جلی حرفوں سے یہ خبر چھپی تھی۔ ''کونسل ہال میں ایک انارکسٹ کا حملہ اور دربان صدر نشین اپنی جگہ پر رہیں اور آپ انھیں اپنی جگہ پر رہنے دیں گے تو کیا مجھے جیل خانہ بھجوا دیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ الکشن بہت اچھی چیز

ہے، خدا کی دین ہے، یعنی اللہ دے اور بندہ لے۔ اس محاورے کے استعمال میں ممکن ہے مجھ سے غلطی ہوئی ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ الکشن نہایت اچھی چیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی ہندوستان میں فضا اس کے لیے موزوں نہیں ہے۔ یہاں الکشن میں بالعموم اسی کی فتح ہوتی ہے جس کے پاس روپیا ہے یا جس سے لوگ ڈرتے ہیں۔ ووٹروں کو فکر و عمل کی آزادی نہیں ہے۔ مستثنیٰ حالتوں کے علاوہ یہاں کامیاب ممبر کے بارے میں یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ وہ اپنے حلقۂ انتخاب کا صحیح نمائندہ ہے۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ الکشن کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ اس بے روزگاری کے دور میں الکشن نفع بخش چیز ہے۔ مثلاً آپ کسی کے مقابلے میں کھڑے ہو کر خوب ہنگامہ مچائیے۔ دولت مند امیدوار آپ کو روپے دلا کر بیٹھ رہنے پر راضی کر لے گا۔ اس کے بعد آپ اس کے کارکن بن جائیں گے تو اور روپے مل جائیں گے۔ آپ ذرا ایمان دار قسم کے آدم ہوں تو کوئی ادارہ کھول دیجیے، مثلاً مدرسہ، یتیم خانہ، پنجرہ پول وغیرہ کہیے کہ آپ کے ادارے کو پانچ سو روپے دلائے جائیں تو آپ بیٹھ رہیں گے، روپے مل جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ اس سلسلے میں اپنی زیر باریوں کی تلافی کے لیے زرعطیہ سے کچھ نہ کچھ وصول ہی کر لیں گے اور اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے کہ آپ اتنے خوش قسمت نہیں ہوں گے کہ اتنی ذرا سی رقم سے آپ کی تمام زیر باریاں دور ہو جائیں گی۔

اب رہا یہ امر کہ الکشن نہ ہو تو کیا ہو، اس پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ کسی گانو میں ایک لال بجھکڑ رہتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی سخت معاملہ پیش آ گیا، جس کو سلجھانے کے لیے لوگ لال بجھکڑ کے یہاں ایک وجد لے گئے۔ لال بجھکڑ سے کون واقف نہیں ہے، بہت ممکن ہے اس وقت آپ کے آس پاس بیٹھے ہوں اور اپنا نام سن کر کان کھڑے کریں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ جس کے کان نمایاں دیکھیں ان کو لال بجھکڑ قرار دے دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کانوں سے لال بجھکڑ کا کوئی تعلق نہیں ہے اور کانوں ہی کیا لال بجھکڑ کا کان، ناک، آنکھ، زبان کسی سے کوئی واسطہ نہیں، وہ صرف عقل سے کام لیتے ہیں۔ لال بجھکڑ عقل سے جس قسم کا کام لیتے ہیں، اس قسم کا کام عقل سے دوسرے نہیں لیتے لیکن یہاں کچھ خلط مبحث ہو رہا ہے۔

واقعہ صرف یہ ہے کہ گانو والے ایک مشکل میں مبتلا ہو گئے تھے، چنانچہ وہ ایک وفد لے کر لال بجھکڑ کے یہاں گئے۔ لال بجھکڑ نے سارا واقعہ سن کر ایک چنگھاڑ ماری اور زار و قطار رونے لگے۔ ابھی لوگوں کا تعجب ختم نہیں ہوا تھا کہ موصوف رکے اور ایک سخت قہقہہ مار کر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد لوگوں نے جذبات کے اس نشیب و فراز کی حقیقت دریافت کی تو لال بجھکڑ یوں گویا ہوئے۔

''بھائی رویا تو یہ سوچ کر کہ اب اس گانو کے ایسے بُرے دن آن لگے ہیں کہ لوگ ذرا سی بات ہر بھی مجھ سے رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر میں مر جاؤں تو کیا ہو، اور ہنسا یوں کہ وہ بات میری بھی سمجھ میں نہ آئی۔''

☆☆☆

کرشن چندر

دوفرلانگ لمبی سڑک

کچہریوں سے لے کرلا کالج تک بس یہی کوئی دوفرلانگ لمبی سڑک ہوگی، ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا ہے، کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر، سڑک کے دورویہ شیشم کے سُوکھے سُوکھے اداس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حُسن ہے نہ چھاؤں، سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ، سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں، نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے، نہ شگاف، سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے اور اب اس پر کول تار بھی بچی ہے، جس کی عجیب سی بُو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں۔ لمبی لمبی، چوڑی چوڑی سڑکیں، برادے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر سُرخ بجری ہوئی تھی، سڑکیں جن کے گرد سرد، شمشاد کے درخت کھڑے تھے، سڑکیں۔۔ مگر نام گنانے سے کیا فائدہ اس طرح تو اَن گنت سڑکیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں۔ کسی اپنے گہرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا، متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں اور ہر صبح اپنے گھر سے جو کچہریوں کے قریب ہی سے اُٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لاء کالج کے پاس ہی ہے بس یہی دوفرلانگ کی سڑک، ہر صبح اور ہر شام کچہریوں سے لے کر لاء کالج کے آخری دروازے تک، کبھی سائیکل پر کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا، اس کی ہئیت میں تبدیلی نہیں آتی۔ اس کی صورت میں روکھا پن بدستور موجود ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے کسی کی کیا پرواہ ہے اور یہ ہے بھی سچ اسے کسی کی پروا کیوں ہو؟ سینکڑوں، ہزاروں انسان۔ گھوڑے گاڑیاں، موٹریں اس پر سے ہر روز گزر جاتی ہیں اور پیچھے کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ ہے جیسی پہلے روز تھی۔ جب ایک یوریشین ٹھیکے دار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے ہی ان نو سالوں میں اس نے کیا کیا واقعات، حادثے دیکھے۔ ہر روز ہر لمحہ کیا نئے تماشے نہیں دیکھتی، لیکن کسی نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا، نہ روتے ہی، اس کی پتھریلی چھاتی میں کبھی ایک درز بھی پیدا نہیں ہوئی۔

''ہائے بابو، اندھے محتاج، غریب فقیر پر ترس کر جاؤ رے بابا، اے بابو، خدا کے لیے ایک پیسہ دیتے جاؤ رے بابا، ارے کوئی بھگوان کا پیارا نہیں، صاحب جی میرے ننھے ننھے بچے بلک رہے ہیں، ارے کوئی تو ترس کھاؤ ان یتیموں پر۔''

بیسیوں گداگر اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے تو کوئی لُنجا۔ کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچے گود میں لیے حسرت بھری نگاہوں سے راہگیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے۔ کوئی پیسہ دے دیتا ہے۔ کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے، کوئی گالیاں دے رہا ہے، حرام زادے، مسٹنڈے، کام نہیں کرتے۔ بھیک مانگتے ہیں۔

کام، بے کاری، بھیک۔

دولڑکے سائیکل پر سوار ہنستے جا رہے ہیں، ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی بھکارن کی طرف دیکھ رہا ہے اور اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ ایک سُست مضمحل کتا فٹن کے پہیوں تلے آ گیا ہے۔ اس کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہہ رہا ہے اس کی آنکھوں کی افسردگی، بے چارگی، اس کی ہلکی ہلکی درد ناک ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتی۔ بوڑھا آدمی اب گدیلوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوش نما سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کیے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی جا رہی ہے، اس کی سیاہ ساڑھی کا نقرئی حاشیہ بوڑھے کی حریص آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی جگہ چھدری چھاؤں میں ایک ٹانگے والا گھوڑے کو سستا رہا ہے گدھ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں، پولیس کا سپاہی آتا ہے، ایک زور کی سیٹی، او ٹانگے والے یہاں کھڑا کیا کرر ہا ہے، کیا نام ہے تیرا، کر دوں چالان؟ ہجور، ''ہجور کا بچہ! چل تھانے،'' ''ہجور!'' ''یہ تھوڑا ہے، اچھا جا تجھے معاف کیا۔''

تانگے والا تانگے کو سر پٹ دوڑائے جا رہا ہے۔ راستے میں اک 'گورہ' آ رہا ہے۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپی ہاتھ میں بید کی چھڑی، رخساروں پر پسینہ۔ لبوں پر کسی ڈانس کا سُر۔

کھڑا کر دو، کنٹونمنٹ۔

آٹھ آنے صاحب

ول، چھ آنے

نہیں، صاحب

کیا بکتا ہے، ٹم۔۔۔۔۔۔۔۔

تانگے والے کو مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے، پھر تانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔لوگ اکھٹے ہورہے ہیں، پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے، حرام زادے، صاحب بہادر سے معافی مانگو، تانگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے۔لوگ منتشر ہوجاتے ہیں۔

اب سڑک پھر سنسان ہے۔

شام کے دھند لکے میں بجلی کے قمقمے روشن ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ کچہریوں کے قریب چند مزدور بال بکھرے، میلے لباس پہنے باتیں کررہے ہیں۔

بھیّا بھرتی ہوگیا۔

ہاں۔

تنخواہ تو اچھی ملتی ہوگی۔

ہاں

بڑھئو کے لیے کمالائے گا۔ پہلے بیوی تو ایک ہی پھٹی ساڑھی میں رہتی تھی۔

سُنا ہے، جنگ شروع ہونے والی ہے۔

کب شروع ہوگی؟

کب؟ اس کا تو پتہ نہیں، مگر ہم گریب ہی تو مارے جائیں گے۔

کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر۔

ننھا کیسا ہے؟

بخار نہیں ٹلتا، کیا کریں۔ادھر جیب میں پیسے نہیں ہیں اُدھر حکیم سے دوا۔۔۔۔۔

بھرتی ہوجاؤ

سوچ رہے ہیں

رام رام

رام رام

پھٹی ہوئی دھوتیاں ننگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم، یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ نہ تو آزادی چاہتے ہیں نہ حریت۔ یہ کیسی عجیب باتیں ہیں، پیٹ، بھوک۔ بیماری، پیسے، حکیم کی دوا۔ جنگ۔

قمقموں کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں، ایک بوڑھی ایک جوان، اپلوں کے ٹوکرے اٹھائے خچّر وں کی طرح ہانپتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے۔

''بیٹی ذرا ٹھہر تو۔'' بوڑھ عورت کے چہرے پر بے شمار جھرّ یاں ہیں اس کی چال مدّھم ہے۔ اس کے لہجے میں بے کسی ہے۔

بیٹی، میں، ذرا ٹھہر، میں تھک گئی۔۔۔۔۔۔ میرے اللہ!

اماں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے، تُو تو باؤلی ہوئی ہے۔

اچھا بیٹی، اچھا بیٹی۔

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے۔ بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے، اُپلوں کا بوجھ اُٹھائے ہوء، کوئی اس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا، کوئی اسے ایک لمحہ ستانے نہیں دیتا، وہ بھاگی جا رہی ہے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ اس کی جھریوں میں غم اور بھوک اور فکر اور غلامی اور صدیوں کی غلامی!

تین چار نوخیز لڑکیاں۔ بھڑکیلی ساڑھیاں پہنے۔ بانہوں میں بانہیں ڈالے جا رہی ہیں۔

بہن، آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں۔

بہن، آج لارنس گارڈن چلیں۔

بہن، آج انارکلی

ریگل؟

شٹ اپ یُو فول

آج سڑک پر سُرخ حلوان بچھا ہے، آر پار جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں، جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں۔ کسی بڑے آدمی کی آمد ہے جبھی تو اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے سڑک پر دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہیں۔ ان کے لبوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں، ان کے چہرے دھوپ کی حدّت سے تمتا اٹھے ہیں۔ اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹے سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں جب وہ

پہلے پہلے یہاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔ اب سب چپ ہیں۔ چند لڑکے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے۔ اب اُستاد انھیں کان سے پکڑ کر اُٹھار ہے ہیں۔ شفیع کی پگڑی کھل گئی تھی۔ استاد اسے گھور کر کہہ رہا ہے۔ اوشفی، پگڑی ٹھیک کر، پیارے لال کی شلوار اُس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور ازار بند جوتیوں تک لٹک رہا ہے۔ ''تمھیں کتنی بار سمجھایا ہے پیارے لال!''

''ماسٹر جی۔ پانی۔''

پانی کہاں سے لاؤں، یہ بھی تم اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ دو تین منٹ اور انتظار کرو، بس ابھی چھٹی ہوا جاتی ہے۔

دو منٹ، تین منٹ، آدھ گھنٹہ۔

ماسٹر جی، پانی۔

ماسٹر جی بڑی پیاس لگی ہے۔

لیکن استاد اب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے اور وہ اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے ہیں۔ لڑکو ہوشیار ہو جاؤ۔ دیکھو جھنڈیاں اس طرح ہلانا، ابے تیرے جھنڈی کہاں ہے؟ قطار سے باہر ہو جا، بدمعاش کہیں کا۔۔۔۔۔ سواری آرہی ہے۔

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، بینڈ کا شور، پتلی اور چھوٹی جھنڈیاں بے دلی سے ہلتی ہوئی۔ سوکھے ہوئے گلوں سے پژمُردہ نعرے۔

بڑا آدمی سڑک سے گزر گیا، لڑکوں کی جان میں جان آئی ہے۔ اب وہ اُچھل اُچھل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔

خوانچے والوں کی صدائیں۔ ریوڑیاں۔ گرم گرم چنے۔ حلوا پوری، نان، کباب۔

ایک خوانچے والا ایک طرے والے بابو سے جھگڑ رہا ہے مگر آپ نے میرا خوانچہ الٹ دیا۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ میرا تین روپے کا نقصان ہو گیا، میں غریب آدمی ہوں، میرا نقصان پورا کر دیجیے تو میں جانے دوں گا۔

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بھنگی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ اس کے منہ اور ناک پر کپڑا بندھا ہے۔ جیسے بیلوں کے منہ پر جب وہ کولھو چلاتے ہیں۔ وہ گرد و غبار میں اَٹا ہوا ہے اور جھاڑو دیے جا رہا ہے۔

میونسپلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا ہے چھکڑے کے آگے جُتے ہوئے دو بیلوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہو گئے ہیں۔ جھکڑے والا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بیلوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حصہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بوڑھا گداگر امرا پڑا ہے۔ اس کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اس

کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

خدا کے لیے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ رے بابا۔

کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا۔ سڑک خاموش اور سنسان ہے، یہ سب کچھ دیکھتی ہے۔ سنتی ہے۔ مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی انسان کے دل کی طرح بے رحم، بے حس اور وحشی ہے۔

انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر اسے غائنا میٹ لگا کر اُڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو، ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے۔ اس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہوگی، اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں، چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلّا چلّا کر کہوں۔ ''میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت ہے، مجھے انسانوں نفرت ہے۔ مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں اُن سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔''

سڑک خاموش ہے اور سنسان۔ بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے اونگھ رہے ہیں

یہ دو فرلانگ لمبی سڑک!

☆☆☆

میر تقی میر

غزل

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک ، مِرے منہ کو دھوتا رہے گا

بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں
جہاں کو کہاں تک ڈبوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

☆☆☆

مرزا محمد رفیع سودا

غزل

مقدور نہیں اس کی تجلّی کے بیاں کا
جُوں شمع سراپا ہو اگر صَرف زباں کا

پردے کو تعین کے درِ دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پَل میں طلسمات جہاں کا

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلے گل کی، تو موسم ہے خزاں کا

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا ، سفر ایسا ہے کہاں کا

سوداؔ جو کبھی گوش سے ہمت کے سُنے تو
سودا جو کبھی گوش سے ہمت کے سُنے تو

☆☆☆

خواجہ میر دردؔ

غزل

اگر یوں ہی دل یہ ستاتا رہے گا
تو اک دن مراجی ہی جاتا رہے گا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں
میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا

جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے
تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا

قفس میں کوئی تم سے اے ہم صفیرو
خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا

اگر تجھ کو چلنا ہے چل ساتھ میرے
یہ کب تک تو باتیں بناتا رہے گا

خفا ہوکے اے دردؔ مر تو چلا ہے
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

☆☆☆

مرزا غالب

غزل

دل ہی تو ہے نہ سنگ نہ خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار ، کوئی ہمیں ستائے کیوں ؟

دیر نہیں ، حرم نہیں ، در نہیں ، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم ، غیر ہمیں اٹھائے کیوں ؟

قیدِ حیات و بندِ غم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی ،غم سے نجات پائے کیوں ؟

حُسن اور اُس پہ حُسن ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں ؟

واں وہ غرورِ عزّو ناز ، یاں یہ حجاب پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں ، بزم میں وہ بلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست ، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز ، اس کی گلی میں جائے کیوں ؟

غالبِ خستہ کے بغیر ، کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں ؟

☆☆☆

مرزا داغ دہلوی

غزل

ناروا، کہیے، ناسزا کہیے
کہیے کہیے مجھے بُرا کہیے

تجھ کو اچھا کہا ہے کس کس نے
کہنے والوں کو خیر ، کیا کہیے

صبر فرقت میں آہی جاتا ہے
پر اسے دیرآشنا کہیے

آ گئی آپ کو مسیحائی
مرنے والوں کو مرحبا کہیے

آپ کا خیرخواہ میرے سِوا
ہے کوئی اور دوسرا ، کہیے

ہوش جاتے رہے رقیبوں کے
داغؔ کو اور باوفا کہیے

☆☆☆

شادؔ عظیم آبادی

غزل

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ہوں اس کوچے کے ہر ذرے سے آگاہ
ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونق بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شادؔ دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

☆☆☆

نظیرا کبرآبادی

مُفلسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی　　پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
کس کس سے اس کو ستاتی ہے مفلسی　　بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہلاتے ہیں　　پوچھے کوئی الف، تو اُسے بے بتاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں　　وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
اُن کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

جب روٹیوں کے بٹنے کا آ کر پڑے شمار　　مفلس کو دیویں ایک تو نگر چار چار
گر اور مانگے وہ تو اسے جھکڑیں بار بار　　مفلس کا حال آہ بیاں کیا کروں میں یار
مفلس کو اس جگہ بھی چباتی ہے مفلسی

نقاش پر بھی زور جب آ مفلسی کرے　　سب رنگ، دم میں کردے، مصور کے کِر کِرے
صورت ہی اُس کی دیکھ کے، منہ کھینچ رہے پرے　　تصویر اور نقش میں کیا رنگ وہ بھرے
اُس کا تو منہ کا رنگ اُڑاتی ہے مفلسی

مُفلس، جو بیاہ بیٹی کا کرتا ہے بُول بُول　　پیسا کہاں، جو جاکے وہ لاوے جہیز مول
جو روکا وہ گلا ہے، کہ پھوٹا ہو جیسے ڈھول　　گھر کی حلال خوری تلک کرتی ہے ٹھٹھول
ہیبت تمام اُس کی اُٹھاتی ہے مفلسی

کیسا ہی آدمی ہو، پر افلاس کے طفیل　　کوئی گدھا کہے اُسے، ٹھہراوے کوئی بیل
کپڑے پھٹے تمام، بڑھے بال پھیل پھیل　　منہ خشک، دانت زرد، بدن پر جما ہے میل
سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

ہر آن دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے　　جو آشنا ہیں، اُن کی تو اُلفت گھٹاتی ہے
اپنوں کی مہر، غیر کی چاہت گھٹاتی ہے　　شرم و حیا و عزت و حُرمت گھٹاتی ہے
ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یارو، تا فقیر　　خالق، نہ مفلسی کو کرے اسیر
اشرف کو بنات ہے اِک آن میں حقیر　　کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیرؔ
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

☆☆☆

میر انیسؔ

صبح شہادت

جب رات عبادت میں بسر کی شہِ دیں نے — سجدوں میں مہم عشق کی سر کی شہِ دیں نے
دیکھا جو سپیدی کو سحر کی شہِ دیں نے — مُڑ کر رخِ اکبر پہ نظر کی شہِ دیں نے
فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا
لو اُٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا

دنیا میں ازل سے سحر ایسی نہیں آئی — یہ صبح دکھائے گی بھرے گھر کی صفائی
دولت نہ رہے گی بہ بضاعت نہ کمائی — بیٹے سے جدا ہوگا پدر، بھائی سے بھائی
آج احمد و حیدر کے گریبان پھٹیں گے
اٹھارہ بنی فاطمہ کے حلق کٹیں گے

بندہ وہی جو دکھ میں رہے صابر و شاکر — اک جاں ہے سو موجود ہے اک سر ہے سو حاضر
بہتر ہے اُٹھے جتنا سبکسار مسافر — یہ مرحلۂ عمر کی ہے آخری منزل
خلقت ہمیں سر پیٹے گی روئے گی جہاں میں
اب صبح کوئی ہم کو نہ ہوئے گی جہاں میں

یہ کہو کے بڑھے تیمم شہ صفدر — جنگل میں اذان دینے لگا دل برِ سرور
وہ صورتِ حُسن اور وہ خوش لحنی اکبر — ہر شخص کو یاد آگئی آواز پیمبر
ہر نخل کو اک وجد تھا اس ظلم کے بن میں
تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

اکبر کی صدا سنتے ہی زینب یہ پکاری   تا حشر رہے خلق میں آواز تمھاری
قربان موذن کے نمازی کے میں واری   قائم یہ جماعت رہے یا حضرت باری
ہر شام یوں ہی طاعتِ معبود ادا ہو
ہر صبح کو اس دین کے ڈنکے کی صدا ہو

آگے تھا غبار اڑھے ہوئے شاہ حجازی   پیچھے تھے صفیں باندھے ہوئے سارے نمازی
ابرارِ جہاں فخرِ ماں صفدر وغباری   تھی ان پہ خدا کی نظرِ بندہ نوازی
دنیا میں یہ رتبے نہ کبھی ہوں گے کسی کے
معراج میں تھے ساتھ حسین ابن علی کے

وہ چاند سے چہرے وہ سپید اُن کی عبائیں   وہ جوش زبانوں پہ اثر داد دعائیں
لہجے وہ عرب کے وہ خوش آیند صدائیں   مشتاق تھیں حوریں کہ یہ جلدی ادھر آئیں
اک جوشِ محبت انھیں دکھلاتا تھا کوثر
کیا سب کی ملاقات پہ لہراتا تھا کوثر

تسبیح و وظائف سے ہوئی جب کہ فراغت   حضرت نے پڑھی اُٹھ کے محمد کی زیارت
بس ہوگئی اک مجلس ماتم وہ جماعت   فرما کے یہ ان سب سے گئے خیمہ میں حضرت
باہر علَم فوج خدا لاتے ہیں جلدی
سب لوگ مسلح ہوں کہ ہم آتے ہیں جلدی

☆☆☆

الطاف حسین حالیؔ

نشاطِ اُمید

اے میری اُمید، میری جاں نواز　　اے مری دل سوز ،میری کار ساز

میری سپر اور مرے دل کی پناہ　　درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ

عیش میں اور رنج میں میری شفیق　　کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

کاٹنے والی غمِ ایّام کی　　تھامنے والی دلِ ناکام کی

دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ　　تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سُکھ

تونے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ　　تونے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

جی کو ہوا اگر کبھی عُسرت کا رنج　　کھول دیے تونے قناعت کے گنج

تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہر اس　　تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس

خاطر رنجور کا درماں ہے تو　　عاشق مہجور کا ایماں ہے تو

نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو　　چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو

رام کے ہمراہ چڑھی رن میں تو　　پانڈووں کے ساتھ پھری بَن میں تو

تو نے سدا قیس کا بہلایا دل　　تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل

ہوگیا فرہاد کا قصہ تمام　　پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام

تونے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس　　ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس

ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب　　مشکلیں آسان نظر آتی ہیں سب

ہاتھ میں جب آکے لیا تونے ہات　　سات سمندر سے گزرتا بے بات

ساتھ ملا جس کو ترا دو قدم　　کہتا ہے وہ یہ ہے عرب و عجم
گھوڑے کی لی اپنے جہاں تونے باگ　　سامنے ہے تیرے گیا اور پراگ
عزم کو جب دیتی ہے تو میل جست　　گنبد گردوں نظر آتا ہے پست
تونے دیا آکے اُبھار جہاں　　سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں
ذرے کو خورشید میں دے تو کھپا
بندے کو اللہ سے دے تو ملا

☆☆☆

اکبرالہ آبادی

نصیحت اخلاق

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے
ہے زندگی کا لطف تو دل کا سرور ہے

گھر میں اسی کے دم سے ہے ہر سمت روشنی
نازاں ہے اس پہ باپ تو ماں کو غرور ہے

خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں
کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے

اکبرؔ بھی اس خیال سے کرتا ہے اتفاق
اس کا بھی ہے یہ قول کہ ایسا ضرور ہے

البتہ شرط یہ ہے کہ بیٹا ہے ہونہار
مائل ہے نیکیوں پہ برائی سے دور ہے

سنتا ہے دل لگا کہ بزرگوں کی پند کو
وقتِ کلام لب پہ جناب و حضور ہے

بتاؤ اس کا صدق و محبت سے ہے بھرا
اس میں نہ ہے فریب نہ کچھ مکروزور ہے

انکار والدین میں ہے دل سے وہ شریک
ہمدرد ہے معین ہے اہلِ شعور ہے

راضی ہے اس پہ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت
صابر ہے با ادب ہے عقیل و غیور ہے

رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال
نیکوں کا دوست صحبت بد سے نفور ہے

کسب کمال کی ہے شب و روز اس کو دھن
علم و ہنر کے شوق کا دل میں وفور ہے

لیکن جو ان صفات کا مطلق نہیں پتا
اور پھر بھی خوشی تو خوشی کا قصور ہے

☆☆☆

پنڈت برج نرائن چکبست

گوپال کرشن گوکھلے

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے — وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے — زمیں پہ تاج گِرا قومِ ہند کے سر سے
حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
زمیں اُلٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

بڑھی ہوئی تھی نحوست زوال پیہم کی — ترے ظہور سے تقدیر قوم کی چمکی
نگاہِ یاس تھی ہندوستاں پہ عالم کی — عجیب شے تھی مگر روشنی ترے دم کی
تجھی کو ملک میں روشن دماغ سمجھے تھے
تجھے غریب کے دل کا چراغ سمجھے تھے

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ — سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چُنے رفاہ کے گل حُسنِ انتخاب کے ساتھ — شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشو ونما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

رہا مزاج میں سودائے قوم خو ہو کر — وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہو کر
بند میں جان رہی وقف آبرو ہو کر — رگوں میں جوشِ محبت رہے لہو ہو کر
خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

وطن کی جان پہ کیا کیا تباہیاں آئیں　　اُمڈ اُمڈ کے جہالت کی بدلیاں آئیں
چراغِ امن بجھانے کو آندھیاں آئیں　　دلوں میں آگ لگانے کو بجلیاں آئیں
اس انتشار میں جس نور کا سہارا تھا
اُفق پہ قوم کے وہ ایک ہی ستارا تھا

حدیثِ قوم بنی تھی تری زباں کے لیے　　زباں ملی تھی محبت کی داستاں کے لیے
خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے لیے　　کہ تیرے ہاتھ میں ناقوس تھا اذاں کے لیے
وطن کی خاک تری بارگاہِ اعلا ہے
ہمیں یہی نئی مسجد نیا شوالا ہے

رہے گا رنج زمانے میں یادگار ترا　　وہ کون دل ہے کہ جس میں نہیں مزار ترا
جو کل رقیب تھا ہے آج سوگوار ترا　　خدا کے سامنے ہے ملک شرمسار ترا
پلی ہے قوم ترے سایۂ کرم کے تلے
ہمیں صیب تھی جنت ترے قدم کے تلے

☆☆☆

جوشؔ ملیح آبادی

کوہستانِ دکن کی عورت

یہ اُبلتی عورتیں ، اس چلچلاتی دھوپ میں ۔۔۔ سنگِ اسود کی چٹانیں ، آدمی کے روپ میں
واہ کیا کہنا ترا، اے حُسنِ ارضِ آفتاب ۔۔۔ یہ برشتہ رنگ ، یہ تپتے ہوئے سنگیں شباب
ہر سراپا ، بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل ۔۔۔ اتنی بے پایاں صلابت پر بھی پر ہر نقشہ سجل
چال ، جیسے تند چشمے ، تیوریاں ، جیسے غزال ۔۔۔ عارضوں میں جامنوں کا رنگ، آنکھیں بے مثال پھٹ
عورتیں ہیں، یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب ۔۔۔ پڑا ہے جن پہ طوفان خیز پتھریلا شباب
یہ جواں چہرے ، یہ چہروں میں برنائی کا جوش ۔۔۔ تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش
جسم ہیں کچھ اِس قدر ٹھوس ، الحفیظ والاماں ۔۔۔ لیجیے ، چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں
مچھلیاں شانوں کی اُبھری سی ، بٹی سی کاکلیں ۔۔۔ آہن و فولا د کے پٹھے ، سلاخوں کی رگیں
دید کے قابل ہیں اِن کا فر بتوں کا رنگ روپ ۔۔۔ کھپ چکی ہے جس میں بارش، ڈس چکی ہے جس کو دھوپ
ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی ، الاماں ۔۔۔ پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں
کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنھیں ۔۔۔ آندھیوں کے پالنے میں ، نیند آتی ہے جنھیں

کیا خبر، کتنے دلوں کی جوشؔ پامالی ہوئی
ان اَداؤں سے کہ طوفان کی ہیں پالی ہوئی

☆☆☆

رُباعیات

امجد حیدرآبادی

(۱)

کس برق کی ہر آن چمک رہتی ہے
کس گُل کی دماغ میں مہک رہتی ہے
ٹوٹا ہے ضرور کوئی کانٹا دل کا
جب دیکھیے کچھ کھٹک رہتی ہے

(۲)

گردش کیوں کُو بہ کُو ہے معلوم نہیں
دل کی کیا آرزو ہے معلوم نہیں
جب دیکھیے جستجو میں سر گرداں ہوں
کس چیز کی جستجو ہے معلوم نہیں

☆☆☆

یاس یگانہ چنگیزی

(۱)

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تیری حیاتِ فانی کیا ہے
جھونکا کھانے اور سنبھلتے رہنے کے سوا

(۲)

موجوں سے لپٹ کے پار اُترنے والے
طوفانِ بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس چلا تو جان پر کھیل گئے
کیا چال ہیں ڈوب مرنے والے

☆☆☆